رُوداد سیمینار

اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل

مرتبہ

اعجاز راہی

مقتدرہ قومی زبان ۔ اسلام آباد

rekhta

رُوداد سیمینار

اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل

جملہ حقوق بحق مقتدرہ محفوظ ہیں

سلسلۂ مطبوعات :
مقتدرہ : ۶۱
خصوصی منصوبے : ۳

○

طبع اول : مارچ ۱۹۸۶ء

تعداد : دو ہزار

قیمت : مجلد : ۵۳ روپے
غیر مجلد : ۳۵ روپے

طابع : المعارف ، گنج بخش روڈ ، لاہور
بوساطت عظیم پرنٹنگ کارپوریشن ، لاہور

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
(صدر نشین)
مقتدرہ قومی زبان
مکان نمبر ۱۰ ، گلی نمبر ۳۲
ایف ۱/۸ ، اسلام آباد -

○

رُوداد سیمینار

اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل

مرتبہ

اعجاز راہی

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

۱۹۸۶ء

rekhta

ترتیب

سیمینار - چند معروضات	اعجاز راہی		۷
افتتاحی خطبہ	بریگیڈیر (ریٹائرڈ) گلزار احمد		۱۲
چند کلمات (افتتاحی اجلاس)	بیگم ثاقبہ رحیم الدین خان		۱۳
اردو زبان میں ترجمے کے مسائل	لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جمال سید میاں وزیر ثقافت، کھیل و سیاحت		۱۶
اردو زبان میں ترجمے کے مسائل	مقبول احمد خان وزیر مملکت برائے مذہبی و اقلیتی امور		۱۹
ادب میں تراجم کی اہمیت (اختتامی اجلاس)	ڈاکٹر غلام علی الانا وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد		۲۱

پہلی نشست : اصولی مباحث اور جائزے

فن ترجمہ کے اصولی	مظفر علی سید	(مقالہ)	۳۱
مباحث	پروفیسر رشید امجد	(تبصرہ)	۴۳
اردو کے سائنسی اور فنیاتی	طارق محمود	(مقالہ)	۴۷
تراجم کا جائزہ	ڈاکٹر اسلم فرخی	(تبصرہ)	۷۴
اردو زبان میں ادبی تراجم	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	(مقالہ)	۷۹
کا جائزہ	ڈاکٹر سہیل احمد خان	(تبصرہ)	۹۵
گفتگو (شرکائے بحث)	ڈاکٹر ریاض محمد، اعجاز راہی		۱۰۱

دوسری نشست : علمی و فنی تراجم کے مسائل

طبعی علوم کا ترجمہ	پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال	(مقالہ)	۱۱۵
مسائل اور مشکلات	پروفیسر محمد انور بھٹی	(تبصرہ)	۱۲۰
سماجی علوم کا ترجمہ۔			
مسائل اور مشکلات	بلال احمد زبیری	(مقالہ)	۱۲۵
گفتگو (شرکائے بحث)	ڈاکٹر انور محمود خالد		۱۳۵

تیسری نشست : دفتری اور قانونی تراجم کے مسائل

دفتری اصطلاحات و			
مراسلت کے تراجم کے	پروفیسر نیاز عرفان	(مقالہ)	۱۶۱
مسائل اور مشکلات	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	(تبصرہ)	۱۷۲
دفتری و قانونی اصطلاحات و دستاویزات کے اردو تراجم۔			
مسائل اور مشکلات	ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی	(مقالہ)	۱۷۵
گفتگو (شرکائے بحث)	ڈاکٹر انور محمود خالد		۱۸۶

چوتھی نشست : ادب اور صحافت میں تراجم کے مسائل

افسانوی ادب کے تراجم۔	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	(مقالہ)	۱۹۷
مسائل اور مشکلات	انتظار حسین	(تبصرہ)	۲۰۳
ادبی تراجم کے مسائل	شان الحق حقی	(مقالہ)	۲۱۱
شعری ادب کے تراجم کے			
مسائل اور مشکلات	پروفیسر جیلانی کامران	(تبصرہ)	۲۲۲
صحافت میں ترجمے کے			
مسائل اور مشکلات	ڈاکٹر مسکین حجازی	(مقالہ)	۲۳۱
گفتگو (شرکائے بحث)	ڈاکٹر ریاض مجید ، اعجاز راہی		۲۴۲

پانچویں نشست : ترتیب سفارشات

قرار دادیں	۲۵۷

سیمینار — چند معروضات

اعجاز راہی

مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام "اردو زبان میں ترجمے کے مسائل" پر دسمبر ۱۹۸۵ء کے اوائل میں ایک سیمینار منعقد ہوا یہ سیمینار اس لحاظ سے اہم تھا کہ ملک کی تاریخ میں پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ ترجمے کی ضرورت اور مسائل پر ملک بھر سے آئے ہوئے دانشوروں نے غور کیا۔ یہ سیمینار تین دن جاری رہا۔ جس کی پانچ مختلف نشستوں میں، سائنسی، معاشی، سماجی، ادبی، صحافتی اور فنی تراجم کی اہمیت، مسائل، طریقہ کار اور اسالیب پر مقالے پڑھے گئے اور مفید گفتگو ہوئی۔

بحث کے دوران کئی اہم سوال ابھرے۔ جہاں ادبی تراجم میں لفظی اور آزاد ترجمے کی بات ہوئی وہیں فنی تراجم میں اصطلاحات کے ترجمے جیسے حساس موضوع بھی زیر بحث آئے۔ سائنسی علوم کی اصطلاحات کے تراجم کے ضمن میں یہ بات شدت سے زیر بحث رہی کہ کیا بین الاقوامی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنا مناسب ہے یا بعینہٖ اختیار کر لینا ہوگا اور یہ کہ جو اصطلاحات اور مختلف اشیاء کے انگریزی نام فی الوقت مستعمل ہیں انھیں یوں ہی رہنے دیا جائے یا ان کا بھی ترجمہ کیا جائے۔ دفتری امور میں ترجمہ کرتے ہوئے ترجمے کے کن بنیادی اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔ یہ سوال بھی موضوعِ گفتگو رہا کہ کیا ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ممکن بھی ہے یا نہیں؟

یہ سیمینار ان تمام سوالوں کا جواب مہیا کرتا ہے۔ اس میں جہاں ماضی کی کوششوں کا ایک جائزہ لیا گیا اور ترجمے مبادیات اصول اور طریقہ کار کے ہر پہلو اور ہر زاویے کو بالتفصیل بحث کا موضوع بنایا گیا، وہیں مستقبل میں ترجمے کے اثرات اور امکانات بھی تلاش کیے گئے۔

مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی نے سیمینار کے آغاز میں سیمینار کے مقصد اور ترجمے کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے، جن تاریخی عوامل اور عمل کاری کی نشان دہی کی، وہ نفاذ اردو کے ان بنیادی اقدامات کی نظری تفصیل تھی، جو اب تک مقتدرہ قومی زبان اس ضمن میں کر چکا ہے۔ اب وہ مرحلہ درپیش ہے جس میں سائنس، فنیات، سیاسیات، ادبیات اور صحافت سے تعلق رکھنے والے علما کی مشارکت لازمی قرار پاتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے فرمایا کہ نفاذ اردو کا عمل اب اس دور میں داخل ہو گیا ہے جہاں اس کے لیے حتمی طریقہ کار اور یکساں معیارات نہایت ضروری ہو گئے ہیں یوں بھی جس انداز سے جدید علوم و فنون سامنے آ رہے ہیں، ترجمے کا تیز رفتار عمل ہی قوم کو جدید دنیا کے ہمرکاب کر سکتا ہے۔ چنانچہ سیمینار میں موجود دانشوروں نے بھرپور انداز میں سیمینار میں وہ تمام امور زیر بحث لانے کی کوشش کی، جنھیں ترجمہ کے باب میں قومی ضرورت کے مطابق سمجھا گیا۔

ترجمہ بنیادی طور پر ان اقوام کی ضرورت ہوتا ہے، جن میں علم کی طلب کا شعور بیدار ہو۔ ازمنہ قدیم ہو، یا زمانہ وسطیٰ، علم کی طلب اور اخذ و اکتساب کا عمل ترقی یافتہ اقوام میں بھرپور جذبے کی صورت ناگزیر حقیقت کے طور پر نمایاں رہا ہے۔ ہر دور میں علم کے طالبوں نے دوسروں کو جاننے اور سیکھنے کے لیے دوسروں کے علم و فضل سے کسب فیض کیا۔ وہ اقوام جنھوں نے روحانی یا مادی ترقی کی انگنت منازل طے کیں، دوسروں کے علوم و فنون کو جاننے کی کوششوں کو ہمیشہ اپنی ترجیحات میں رکھا۔

دوسری اقوام کی ترقی و ارتقا کے عمل کو جاننے سیکھنے کے لیے ترجمے نے ہمیشہ سفارتی پل کا کام دیا ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قوموں کے ارتقا کے سفر میں اگر کلیۃً نہیں تو قابل لحاظ حد تک ترقی کا انحصار ترقی یافتہ اقوام سے کسب فیض پر منحصر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام جو فلسفہ و فکر میں ایک جداگانہ اور منفرد منطقہ رکھتا تھا، اس کے نہایت ترقی یافتہ ادوار میں بھی دوسری اقوام کے علم و فضل سے آگاہی کو ضروری جانا گیا اور جہاں بھی علم و فضل نظر آیا اسے فوری طور پر ترجمہ کرکے مسلمانوں کے لیے علم کی پیاس

بجھانے کا سامان کیا۔ پہلی صدی ہجری کا کام شروع ہو گیا تھا اور مسلمان علما، حکما اور فضلا جہاں بھی علم کی شمع دیکھتے اسے اپنے ہاں روشنی پھیلانے میں بروئے کار لاتے۔ اکابرین علم و فضل نے کسی ایک قوم، کسی ایک ملک یا کسی ایک زبان پر تکیہ نہیں کیا، بلکہ بالکل فطری عمل میں روبہ ترقی قوم کی طرح فطری ضرورتوں کے تحت دنیا بھر کے علم کو اپنے ہاں جمع کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ایک طرف جہاں قدیم فلاسفہ کو عربی کے قالب میں ڈھالنے کے عمل کو یونانی، سریانی کے تراجم کی صنعت تک پھیلایا، وہیں سنسکرت اور فارسی کی قابل قدر کتب بھی عربی میں ڈھالیں، یہاں تک کہ علم و فضل کے ان ذخیروں کے لیے جو ادارہ قائم کیا اسے دارالحکمت کا نام دیا، جس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے علم جاننا کس قدر ضروری سمجھا گیا۔

یہ وہ دور تھا جب علوم و فنون اپنے ابتدائی مرحلوں میں تھے اور ابھی زمین اور فلک نے اپنی کشادگی اور وسعت کا انکشاف نہیں کیا تھا، مگر دور جدید میں ہر نیا لمحہ ایک نئے علمی انکشاف کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔

جدید علوم و فنون، نئی ٹیکنالوجی سائنس کے نئے نئے منکشف ہوتے ہوئے گوشے، معاشی، سماجی علوم کے نئے روپ جدید دنیا کی ترقی کے لیے ناگزیر حقیقت بن گئے ہیں اور ان علوم و فنون کو جانے بغیر کوئی قوم آگے بڑھنے کا تصور نہیں کر سکتی، چنانچہ آج کی ترقی پذیر اقوام کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ علوم جدیدہ کو کس طرح اپنے ممالک میں عام کیا جائے۔ دوسری طرف یہ سوال ایک بڑی حقیقت کے طور پر موجود ہے کہ دنیا کی کوئی قوم علم کو اپنی زبان کے قالب میں ڈھالے بغیر اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ ماضی کی نسبت موجودہ عصر میں ترجمہ بنیادی ضرورت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ایسی اقوام کے لیے یہ سوال دوہرے چیلنج کی صورت اختیار کر جاتا ہے جہاں غلامی کے طویل ادوار میں تہذیبی، ثقافتی یلغار کے سبب زبانیں مجروح ہو کر اپنا منصب اور مقام کھو چکی ہوں۔ یہاں ایک طرف اپنی زبان کو اس منصب و مقام پر واپس لانے اور دوسری طرف جدید علوم و فنون کو عام کرنے کی لگن کا سوال پیچیدہ اور مشکل صورت حال کو خلق

کرتا ہے ، مگر جو اقوام یہ فیصلہ کر لیں کہ انھیں اپنی قوم کو آگے بڑھانا ہے ، ان کے سامنے یہ پیچیدگیاں اور مشکلات کم تر حیثیت اختیار کر جاتی ہیں - پاکستان آج زندگی کے اسی موڑ پر پہنچ چکا ہے جہاں علم کی طلب کا شعور بیدار ہو کر آگے بڑھنے کے عمل کو تیز کرتا محسوس ہوتا ہے - چنانچہ پاکستانی قوم کے سامنے بھی یہی ناگزیر سوال ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر آن کھڑا ہوا ہے ، جس میں ایک طرف قومی اردو زبان کو پوری سماجی زندگی میں جاری و ساری کرنے کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون ، سائنس و سماجی جدید انکشافات کو عام افراد تک منتقل کرنے کا مرحلہ ایک مہمیز کا طلب‌گار ہے اور مقتدرہ قومی زبان قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے کماحقہ آگاہ ، اپنے آبا کے طرز عمل سے آشنا اپنے فرائض کو پہچانتے ہوئے اور عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق قومی ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے قومی زبان کے دامن کو کشادگی عطا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے - ترجمہ سیمینار اس کی قابل لحاظ مثال ہے اور سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات تبصرے اور عام بحثوں میں دانشوروں کی شعوری بالیدگی اس کا مستحسن ثبوت ہے - زیر نظر کتاب ان ہی مقالات ، تبصروں اور بحثوں کا مجموعہ ہے جو سیمینار میں پڑھے گئے -

اس سیمینار کو کامیابی عطا کرنے کے لیے جس طرح علم و فضل کے ہر شعبہ کے دانشوروں اور اکابرین نے مقتدرہ کے ساتھ معاونت کی ، اس کا شکریہ ادا نہ کرنا ناسپاسی ہوگی- جناب آفتاب احمد خاں، جناب لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن خان ، جناب بریگیڈیر گلزار احمد، جناب ڈاکٹر رفیق احمد ، جناب ڈاکٹر جمیل جالبی اور جناب اشفاق احمد جنھوں نے مختلف اجلاسوں کی صدارت فرمائی - جناب قدرت‌اللہ شہاب ، جناب عرفان احمد امتیازی ، جناب ڈاکٹر نذیر رومانی ، جناب ڈاکٹر آفتاب احمد خان ، محترمہ ثاقبہ رحیم الدین ، جنھوں نے مہمان کی حیثیت سے شرکت فرمائی، جناب مظفر علی سید ، جناب شان الحق حقی ، جناب ڈاکٹر مسکین حجازی ، جناب ڈاکٹر ظفر اقبال ، جناب ہلال احمد زبیری ، جناب ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی ، جناب طارق محمود اور جناب نیاز عرفان نے مقالات پیش کیے اور جناب ڈاکٹر اسلم فرخی ، جناب پروفیسر محمد انور بھٹی ، جناب انتظار حسین ،

جناب ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے ساتھ ساتھ ان تمام احباب کا مقتدرہ احسان مند ہے جنھوں نے سیمینار کے مختلف اجلاسوں میں بحث و تمحیص میں حصہ لے کر جہاں مقتدرہ کے کام کو آسان کیا ، وہیں قومی نوعیت کے اس سیمینار کو کامیاب بنایا ، مقتدرہ ان تمام احباب کو ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے -

---

افتتاحی خطبہ

بریگیڈیر (ریٹائرڈ) گلزار احمد

جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ، محترمہ ثاقبہ رحیم الدین صاحبہ و
معزز خواتین و حضرات !

میرے لیے یہ بات باعث افتخار ہے ، کہ میں ایک ایسے سیمینار کا افتتاح کر رہا ہوں ، جو نفاذ اردو کے ضمن میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس لیے بھی آج کی صدارت میرے لیے سعادت ہے کہ مجھے ملک بھر سے آئے ہوئے اہل علم و فضل سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے ۔

معزز خواتین و حضرات !

بلا شبہ ترجمہ ایک مشکل فن ہے مترجم کے لیے یہ کافی نہیں ہے ، کہ وہ دوسری زبان کے مفہوم کو اپنی زبان میں منتقل کر دے ، بلکہ مترجم کے سامنے دو تہذیبیں کھڑی ہوتی ہیں ۔ ترجمہ لفظی بھی ہوتا ہے اور اس پورے ثقافتی پس منظر کا بھی ، جس میں یہ لفظ تخلیق پاتا ہے ۔ ہر زبان کا اپنا جغرافیائی ، ثقافتی اور سماجی ماحول ہے ۔ اس لیے مترجم جب مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کرتا ہے ۔ تو اس زبان کا پس منظر اور ماحول اور اپنی زبان کی مبادیات اور تقاضوں کو بھی سامنے رکھنے پر مجبور ہوتا ہے ۔ اس کے سامنے یہ ہدف بھی ہوتا ہے ، کہ وہ ایسا ترجمہ کرے ، جو عام آدمی تک تفہیم حاصل کر سکے ۔ اس حوالے سے مترجم نہ صرف اپنے مضمون کہ جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے کا ماہر ہونا چاہیے بلکہ دونوں زبانوں پر قابل لحاظ گرفت بھی رکھتا ہو ۔ وہ دوسری زبانوں میں کہی بات سمجھ سکے ، اور اپنی زبان میں سمجھا سکے ۔

معزز خواتین و حضرات !

ترجمے کے جس سیمینار کا آغاز ہم آج کر رہے ہیں ۔ اس کے اثرات کسی ایک شخص یا ادارے تک محدود نہیں ہوں گے ، بلکہ قومی زبان کے حوالے سے اس کا دائرہ اثر پوری قوم پر محیط ہوگا ۔ اس لیے یہ موضوع ہم سے بہت زیادہ ہوشمندی اور غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے ۔ ہمیں اس سیمینار میں ایسے فیصلے کرنے ہیں ، جو نہ صرف ہمارے قومی تقاضوں کا ساتھ دے سکیں ، بلکہ مترجمین کی مجموعی صلاحیت اور استعداد کو بڑھانے میں بھی مددگار ثابت ہوں اور عام لوگوں کی سماجی نفسیات پر بھی پورے اتر سکیں ۔ علما و فضلا کی اس نشست کی مدد سے مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے مقصد میں ناکام نہیں ہوں گے ۔

خواتین و حضرات !

میں اس دعا کے ساتھ بات ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی کرے اور ہم اس ہدف کو پا لیں ، جس کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں ۔

شکریہ ۔

rekhta

چند کلمات
(افتتاحی اجلاس)

بیگم ثاقبہ رحیم الدین

مجھے سب سے پہلے تو مقتدرہ اور آپ خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ نے مجھے یہ عزت دی کہ میں آپ سے چند باتیں کر سکوں۔ اس کے ساتھ ہی میں مقتدرہ قومی زبان کو مبارک باد پیش کرتی ہوں کہ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اس نہایت اہم موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا۔

معزز خواتین و حضرات!

آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، وہ جدید ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کا دور ہے، اگر کوئی قوم یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس دور کا ساتھ دیے بغیر زندہ رہ سکتی ہے، تو میرے خیال میں یہ درست نہیں ہوگا، کہ سائنس کی برکات اور جدید ٹیکنالوجی کے فیض کو حاصل کیے بغیر آج کوئی قوم آبرو مندانہ طریقے سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ ترقی و ارتقا کے اس عمل کو اپنی زبان میں منتقل کیے بغیر آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ لیکن جب ہم اپنی قومی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں نظر آتا ہے، کہ ہم نے اس میدان میں ابھی خاطر خواہ پیش رفت نہیں کی۔ لہٰذا ان علوم کو ترجمے کے ذریعے ہی اپنی زبان میں منتقل کر کے اس فیض کو عام آدمی تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر ہم جائزہ لیں، تو ابھی ہمیں بہت کام کرنا ہے، نہ صرف یہ کہ زبان کو اس کا منصب و مقام دلانا ہے، بلکہ ان تمام جدید علوم و فنون کو اپنی

زبان میں ڈھالنے کا آغاز بھی کرنا ہوگا۔ میرے نزدیک مایوسی کی کوئی بات نہیں اصلاً کسی مسئلے کا ادراک اولین قدم ہوتا ہے۔ ہم اس مسئلے کی افادیت و اہمیت کا قومی زبان کے حوالے سے شعور حاصل کر چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ سیمینار اسی شعور کا بین ثبوت ہے، جو اس بات کا اشارہ ہے کہ ہم تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسرا قدم قومی تقاضوں کے تحت اسی سمت بڑھے گا، جو ہمارے ارتقا اور ترقی کے لیے ضروری ہے۔

معزز خواتین و حضرات!

ہم سب کو انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر بلکہ ہر سطح پر قومی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے جدید علوم و فنون سے اس کا دامن بھرنا ہوگا اور ایسے انتظامات کرنے ہوں گے جس سے نہ صرف زبان اردو کو ایک ترقی یافتہ زبان بنا سکیں بلکہ اسے اپنے معاشرے میں جائز مقام بھی دلا سکیں، جس کے بغیر یہ ہدف حاصل نہ ہو سکے گا۔ دانشوران عصر کی اس محفل سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے فیصلوں سے یقینی طور پر قابل لحاظ پیش رفت میں کامیاب ہو جائیں گے۔

شکریہ

اردو زبان میں ترجمے کے مسائل

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جمال سید میاں

مجھے آج کے اس اجلاس میں شریک ہوکر دوہری خوشی محسوس ہو رہی ہے - ایک اس لیے کہ یہ اجلاس ایک ایسے سیمینار کا افتتاحی اجلاس ہے جس کا موضوع قومی زندگی کے حوالے سے نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہے - دوسرے اس لیے کہ اس سیمینار کے وسیلے سے میں ملک بھر سے آئے ہوئے دانشوروں سے گفتگو کا شرف حاصل کر رہا ہوں -

معزز خواتین و حضرات! یہ سیمینار بظاہر قومی زبان میں ترجمے کے مسائل پر غور کرنے اور ایسے اصول وضع کرنے کے لیے بلایا گیا ہے جس کے سبب ہم دوسری زبانوں سے کسب فیض کر کے قومی زبان کو سرکاری تعلیمی اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل بنا سکیں، لیکن ایک اس سے بڑا مقصد بھی اس سیمینار کے پس منظر میں موجود ہے - ہم آج جس دور سے گزر رہے ہیں وہ جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے - کسی بھی قوم کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ جدید فنی و سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو حاصل کیے بغیر ترقی کی منزلیں طے کر سکے، چنانچہ ان علوم و فنون کا بھی قومی زبان میں منتقل ہونا نہایت ضروری اور قومی ترقی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ انسان جس قدر اپنی زبان میں آسانی سے بات سمجھ اور سمجھا سکتا ہے دوسری زبان میں اسے یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی، آج کے سیمینار کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ جدید سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو اپنی زبان میں ڈھالنے کے لیے مفید تجاویز مرتب کرے، تاکہ اس سے قومی سطح پر مفید نتائج حاصل کیے جاسکیں اور ترقی کے مراحل میں حائل دشواریوں کو دور کیا جا سکے - مجھے

خوشی ہے کہ مقتدرہ قومی زبان اس ضرورت کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس نے نہایت اہم اقدامات کر کے قومی زبان کو زندگی کے تمام شعبوں تک پھیلانے کے لیے قابل قدر کام بھی کیا ہے - مقتدرہ قومی زبان کے سامنے کئی اہم ہدف ہیں، ان میں سے ایک دفاتر میں نفاذ اردو کا ہے دوسرا تعلیم کا میدان ہے جس میں قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے ان کی مساعی جاری ہے، تیسرا کام جو نہایت اہم ہے وہ ہے، جدید ٹیکنالوجی کو قومی زبان میں منتقل کا کام ہے - آج جب ہم اس سہ روزہ سیمینار میں تراجم کے مسائل پر غور کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ دانشوران عصر ان تمام مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے مثبت سفارشات و تجاویز مرتب کریں گے جس سے ہم قومی زندگی میں فائدے حاصل کر سکیں گے -

خواتین و حضرات! علم کسی بھی زبان سے تعلق رکھتا ہو، اس کو جاننا نہایت ضروری ہوتا ہے ہم اگر اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو یہ محسوس کریں گے کہ بنو امیہ کا دور ہو یا بنو عباس کا بڑے پیمانے پر دارالتراجم کام کرتے نظر آتے ہیں یہ وہ دور تھا جب علوم نے اتنی وسعت نہیں پائی تھی لیکن مسلمانوں کے لیے علم جاننا کتنا متبرک تھا اس کا ایک ثبوت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے ملتا ہے کہ:

”علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے“ -

اس ارشاد کی روشنی میں اگر اپنے دور کا جائزہ لیں تو آج علوم و فنون جس طرح وسعت پا گئے ہیں اور اقوام عالم جس طرح جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم میں پیش رفت کر رہی ہیں انہیں جاننے اور زندگی میں جاری و ساری کیے بغیر کسی بھی قوم کا ترقی کرنا مشکوک سا ہوگیا ہے آپ یورپ کی مثال لیجیے جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم میں مغرب نے قابل لحاظ ترقی کی ہے، لیکن دوسری اقوام سے اخذ و اکتساب کے عمل کو انھوں نے ابھی تک نہیں چھوڑا - آج بھی امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بڑے بڑے دارالتراجم قائم کرکے دوسری اقوام کے نظریات افکار اور علوم کو اپنی زبانوں میں ڈھالنے کا عمل جاری ہے - اس ساری صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری قومی

ضروریات اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی ہیں - ہماری قومی زبان انگریزی کی جگہ لینے کے لیے عبوری دور سے گزر رہی ہے - علوم فنون قومی زبان میں منتقل ہو رہے ہیں ان کی اصطلاحات کی مشکلات اور دوسرے عوامل اس راہ میں حائل ہیں دوسری طرف سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو قومی زبان میں منتقل کرنے کے لیے تیزی سے کام ہو رہا ہے - مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان اور اسی طرح کے کام میں مصروف دوسرے ادارے پلاننگ و شبہہ اس ضمن میں اہم جدوجہد کر رہے ہیں اور لائق مبارک باد ہیں -

خواتین و حضرات! ترجمہ ایک مشکل فن ہے دوسری زبانوں سے صرف الفاظ کا ترجمہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی روح کو بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے - اس وقت ملک میں مختلف ادارے ترجمے کے کاموں میں مصروف ہیں، یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ایسے تمام اداروں کے لیے ایسا معیار قائم کر دیا جائے جسے تمام ادارے خوشی سے اپنائیں اور تراجم کے معیار کو یکسانیت مل سکے - میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ جو کام آپ کرنے جا رہے ہیں قومی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے آپ جو بھی فیصلہ کریں سفارشات اور تجاویز مرتب کریں، اصول بنائیں، یہ بات آپ کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ کوئی قوم بھی اپنی قومی زبان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی آپ جس قدر جلد اُردو کو اعلیٰ علمی سرمائے سے مالا مال کرلیں گے قوم اور ملک کا فائدہ ہو گا اور ہم اقوام عالم میں اپنا مخصوص کردار بہتر طور پر ادا کر سکیں گے اس لیے آپ ترجمے کے کام کو اولیت دیجیے - آخر میں، میں ایک بار پھر ارباب مقتدرہ اور خواتین و حضرات آپ کا شکر گزار ہوں -

اردو زبان میں ترجمے کے مسائل

مقبول احمد خان

میں اہل مقتدرہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس اہم سیمینار میں شرکت کی دعوت دی اور ملک کے ممتاز قلم کاروں سے ملاقات کا موقع فراہم کیا - یہ سیمینار اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں ترجمہ جیسے نہایت اہم موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے اور اس لیے بھی اس کی اہمیت ہے کہ یہاں ملک کے ایسے سکالرز جمع ہیں جن سے علم و فن کے چراغ روشن ہیں - میں اس اجتماع پر سب سے پہلے مقتدرہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور سیمینار کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں -

معزز خواتین و حضرات! آج جس تیزی سے دنیا علوم و فنون کے نئے جزیرے تلاش کر رہی ہے، ہر نیا لمحہ نیا انکشاف لے کر ظاہر ہوتا ہے، جدید ٹیکنالوجی ہر روز ایک نئے قدم کے ساتھ سامنے آتی ہے، ترقی یافتہ اقوام جس تیزی کے ساتھ ترقی و بلندی کی منزلیں طے کر رہی ہیں، اس سارے عمل نے ترقی پذیر اقوام کو ایک بڑے چیلنج کے ساتھ سامنے لا کھڑا کیا ہے اور ایسی صورت میں یہ چیلنج زیادہ شدید تر ہوگا کہ ان ترقی پذیر اقوام کی ترقی و ارتقا کا انحصار جدید علوم و فنون سے وابستگی کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے - میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جن ممالک میں ایجادات و اختراعات ہو رہے ہیں وہ ان کی اپنی قومی زبانوں میں ہیں - چنانچہ ان علوم کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان زبانوں پر قدرت حاصل کی جائے اور انھیں اپنی زبان میں منتقل کیا جائے -

انسان جس قدر آسانی سے اپنی زبان میں افہام و تفہیم کر سکتا ہے دوسری زبان میں اتنا آسان نہیں ہوتا - ضروری ہے کہ ان علوم کو اپنی زبان میں ڈھال دیا جائے تاکہ عام سطح کی ذہانت رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکے اور قومی ترقی میں حصہ لے سکے -

معزز خواتین و حضرات ! ہم ایک ایسی مملکت خداداد سے تعلق رکھتے ہیں جس پر دو سو برس تک غیر ملکی اقتدار رہا ہے غیر ملکی تسلط کے دوران جہاں بہت سی چیزیں بدلی ہیں وہیں ہماری تہذیب و ثقافت بھی بدلی ہے جس کے نتیجے میں ہماری اپنی زبان کی بجائے ایک سو سال سے انگریزی ذریعہ تعلیم اور ذریعہ معاش بنی رہی - ضروری ہے کہ اب ہماری قومی زبان انگریزی کی جگہ لے تا کہ ان تمام محرومیوں کا سدباب ہو جو قومی زبان کی عدم موجودگی میں ہوتی ہیں - مجھے خوشی ہے کہ مقتدرہ قومی زبان دفتری زبان کے طور پر قومی زبان کو لانے کے لیے نہایت اہم اقدامات کر رہا ہے یہ مقتدرہ کی کوششوں کا نتیجہ ہی تھا کہ دو وزارتوں میں اردو کے نفاذ کا اعلان کیا گیا - مقتدرہ اس وقت انگریزی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے ، دفتری مراسلات کو قومی زبان میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ تنظیمی ، مالی اور تکنیکی قوانین اور اصطلاحات کو اردو کے قالب میں اتارنے کے سلسلے میں قابل قدر پیش رفت کر چکا ہے اس ضمن میں اس کی ۳۵ کے قریب کتب کی اشاعت یقیناً قابل تحسین ہے لیکن اب ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ مقتدرہ دفاتر میں نفاذ اردو کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں بھی آگے بڑھے کہ اس کے بغیر قومی زبان کو قومی زندگی میں مکمل تشخص نہیں مل سکتا -

خواتین و حضرات ! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا میں ایک بار پھر آپ کا اور مقتدرہ قومی زبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں بلوایا - میری دعا ہے کہ خدا آپ کی رہنمائی کرے اور سیمینار کو کامیابی دے -

شکریہ

ادب میں تراجم کی اہمیت

(اختتامی اجلاس)

ڈاکٹر غلام علی الانا

کسی بھی زبان کے ادب کا تجزیہ کرنے سے اس زبان کی معاشی معاشرتی ، ذہنی اور فکری ارتقا کا بڑی حد تک پتہ چلتا ہے - زبانیں ایک معاشرتی قوت اور فہم و عقل کے عمیق مہاساگر ، لغت و معنی اور علم و ادب ، تخیلات اور اظہار و ابلاغ کے ایک خزانے کی مانند ہوتی ہیں - دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح پاکستانی زبانیں بھی کسی ایک یا ایک سے زیادہ انسانوں ، عالموں ، ماہروں یا استادوں نے کسی شعوری کوشش سے نہیں بنائیں بلکہ یہ ایک خود کار عمل ہے اور اس طرح گویا یہ قدرت کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں جو انسان کی ذات کے ساتھ وجود میں آئی ہیں - جس طرح ہر زبان روزمرہ کے ماحول کے اندر ہمیشہ مروج ، جاری و ساری، مستعمل اور ہر دور میں متواتر مؤثر رہتی ہے اسی طرح اس میں علم و ادب بھی ہر دور میں تواتر سے پیدا ہوتا رہا ہے -

زندگی کی طرح زندگی کا مقصد بھی ہر گز بے تحریک نہیں ہوتا - زندگی ہمیشہ متحرک اور ہمیشہ ارتقا پذیر رہی ہے - اسی طرح زندگی کا مقصد بھی دائم ارتقا پذیر رہا ہے -

علم و ادب زندگی کا ترجمان ہے - ادب انسان ذات کی تہذیب و ثقافت کی علامت اور ضمانت رہا ہے اور ادب کا مقصد بھی یہی ہے - انسان ہمیشہ ادب سے متاثر ہوتا رہا ہے تاکہ متاثر ہونے کے بعد وہ اپنی زندگی خوب سے خوب تر گزارنے کی صلاحیتوں میں اضافہ کرتا چلا جائے -

دنیا کی مختلف زبانوں میں شروع سے معیاری اور تخلیقی ادب پیدا ہوتا رہا ہے - معیاری اور تخلیقی ادب کے تخلیق کاروں کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ ان کا مطالعہ گہرا ہو - اگر ادیب کا مطالعہ و مشاہدہ گہرا

ہونے کے باوجود وہ لکھنے کی خوبیوں سے بے بہرہ ہوگا تو کامیاب ادیب نہیں بن سکے گا۔

ادیب اپنے معاشرے کے سامنے ہمیشہ جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن اور تخلیق کا وفادار ہوتا ہے۔ سارتر نے خوب کہا ہے:

''اگر ہم نے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا ہے تو پھر ہم میں سے ہر ادیب ادب کے سامنے جواب دہ ہے''

گویا ہماری عام ذمہ داری ادب سے پرخلوص وابستگی ہے۔ ہمیں اپنے فن سے وفادار ہونا چاہیے۔ ایک ادیب یا تخلیق کار جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے یا جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کو چاہیے کہ اس کا بیان یا تذکرہ ایمانداری سے کرے اور دوسروں کے لیے حقیقت پیش کرے۔

ادیب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے وہ اپنے دور کے ماحول اور حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک باہوش پرخلوص ادیب اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہے یا جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ اس کی حقیقی تصویر لفظوں کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ ادیب باضمیر انسان ہوتا ہے وہ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت میں معاشرے کے بیدار ضمیر کی مثال ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب میں جس طرح تخلیقی ادب کا پیدا ہونا اور جاری رہنا بہت اہم عمل ہوتا ہے اسی طرح زندہ زبانوں کے اندر ادیبوں نے دوسری زبانوں کے شہ پاروں کے ترجمے کی اہمیت پر بھی اتنا ہی زور دیا ہے۔

ادب میں ترجمہ ایک بہت اہم لسانی اور فکری عمل ہے اس کے باوجود کچھ تخلیق کار دوست ادب میں ترجمے کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ سندھ کے ایک مایہ ناز ادیب اور تخلیق کار محمد ابراہیم جویو نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے:

کچھ ادیب دوست یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''صرف وہ ادیب دوسری زبانوں کی کتابوں کو ترجمہ کرتے رہتے ہیں جن کے پاس اپنے طور پر پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ صرف دوسروں کی لکھی ہوئی چیزوں کو اپنی زبان میں نقل کرتے رہتے ہیں اور خود کو ادیبوں کی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں''۔

لیکن یہ حقیقت کے برعکس ہے۔ آج کی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی ہر سال ہزاروں کی تعداد میں غیر ملکی زبانوں کے ادب سے شہ پاروں کو ترجمہ کرکے مترجم اور ادیب حضرات اپنی زبان کے علمی سرمائے میں قارئین کے لیے اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری زبانوں میں نثری ادب میں عموماً اور جدید معاشرتی اور طبعی علوم میں خصوصاً معیاری کتابوں کا اگر فقدان نہیں تو کمی ضرور ہے۔ ان موضوعات پر کتابیں اتنی تعداد میں موجود نہیں ہیں جو ہمارے پڑھنے والوں کی ضرورت پوری کرسکیں۔ اس قسم کے موضوعات پر کتابیں ہماری زبان میں بھی اتنی تعداد میں ضرور موجود ہونی چاہییں کہ وہ شخص جو صرف ہماری زبانیں ہی جانتا ہے اور غیر ملکی زبانوں میں مہارت نہیں رکھتا اس کو بھی مذکورہ مواد خاطر خواہ حد تک اپنی زبانوں میں میسر ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں تراجم پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میرا مقصد نہ صرف علمی کتابوں کا ترجمہ کرنا ہے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ غیر ملکی زبانوں میں لکھی ہوئی مشہور و مقبول ادبی کتابوں کو بھی اپنی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا ادب اور ادب کے شائقین ایسی چیزوں سے نا واقف نہ رہ جائیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہم بھی دوسری اقوام کی طرح غیر ملکی زبانوں کی معیاری اور اہم کتابوں کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کریں۔ اس طرح ہماری زبانیں جدید عالمی ادب اور تخلیقی شہ پاروں سے محروم نہیں رہیں گی۔

دنیا کے ادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ادب کا شوق رکھنے والوں نے بے انتہا دولت خرچ کرکے غیر ملکی زبانوں سے معیاری اور اہم کتابوں کو ترجمہ کرایا تاکہ وہ ایسے ادب سے لاعلم نہ رہ جائیں۔ ہماری تاریخ میں بھی ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ ایران کے بادشاہوں، بغداد کے عباسی دور کے خلفا اور مصر کے فاطمی خلفا نے بے انتہا دولت خرچ کرکے نہ صرف نامور شہ پاروں کو عربی میں ترجمہ کروایا بلکہ انھوں نے لائبریریاں قائم کرکے ایک قابل تقلید مثال

rekhta

قائم کر دی ۔ اسلامی تاریخ میں بغداد میں "بیت الحکمہ" اور مصر میں "دارالحکمہ" ایسی لائبریریاں تھیں جو اپنی مثال آپ تھیں ۔ نہ صرف یہ بلکہ برصغیر میں اسلامی حکومت کے اوائلی دور میں سنسکرت اور مقامی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں پنچ تنتر ، کلیلہ دمنہ ۔ نل دمینتی اور ایسی دیگر کتابوں کا فارسی اور عربی میں ترجمہ کرایا گیا ۔ اسی طرح عباسی دور میں جو کتابیں ترجمہ کرائی گئیں ان میں بالخصوص یونانی ماہروں کی فلسفہ اور سیاست پر شاہکار تصنیفات قابل توجہ ہیں ۔ ان کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرکے تحقیق و تفتیش کی راہ ہمیشہ کے لیے ہموار کر دی گئی جس کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں امام غزالی ، ابن رشد ، رومی اور بوعلی سینا جیسی شخصیتوں نے جنم لیا ۔ انگلینڈ اور امریکہ میں آج بھی مسلم اور عرب مفکرین خیام اور خلیل جبران کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ سب ترجمے کی برکت سے ہے ۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ہر زبان کے نثری ادب میں تخلیقی اور شعری ادب سے پہلے تراجم کا عمل شروع ہوتا ہے ۔ ہماری زبانوں خصوصاً اردو ، سندھی اور پنجابی وغیرہ میں ایسا ہی ہوا ہے ۔ نثری ادب کا دور بیشتر تراجم سے شروع ہوتا ہے ۔ ہمارے ادیبوں نے ترجمہ شدہ شہ پاروں سے متاثر ہو کر تخلیقی کام شروع کیا گویا تراجم کے دور کے بعد ادب کا تخلیقی دور شروع ہوتا ہے یعنی تخلیقی ادب کا انحصار بڑی حد تک ترجمہ شدہ شہ پاروں پر ہے ۔ اس لیے ادبی نثر کاروں کے تراجم کسی بھی زبان کے ادب کی توسیع یا ارتقا کے لیے سود مند ثابت ہوتے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے تخلیقی جوہر کو تقویت ملتی ہے ۔ تراجم کو پڑھنے سے تخلیق کاروں میں تخلیق کرنے کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے ۔ نثر اور نظم کے اسالیب میں وسعت پیدا ہوتی ہے ، رجحانات میں تغیر و تبدل کے امکانات روشن ہوتے ہیں ۔ تراجم کے قارئین اپنی تنگ دنیا اور محدود ماحول سے نکل کر وسیع تر فضا میں پہنچ جاتے ہیں اور ایک نئی دنیا کا تجربہ حاصل کرتے ہیں ۔

محترم الیاس عشقی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ :

"ترجمہ ایک دشوار فن سمجھا جاتا ہے ۔ اس وجہ سے بڑے بڑے مترجم اپنے کام سے خوف زدہ رہے ہیں ۔ اس خوف کے کئی ڈراؤنے

پہلو ہیں ۔ جتنا خوف اتنے وسوسے ، ہزار باتیں سننے میں آتی ہیں مثلاً یہ کہ مترجم کے لیے اسی پائے کے علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کتاب اور فن پارے کے مصنف کا ہو جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہو ۔ مصنف تو جس زبان میں لکھتا ہے چاہے اس زبان کا ماہر ہو نہ ہو لیکن مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان زبانوں کا ماہر ہو ، ایک وہ زبان جس کا ترجمہ کرنا ہے دوسری وہ جس میں ترجمہ کرنا ہے ۔ اس لیے اصل مصنف کے انداز بیان اور لسانی خصوصیات کے علاوہ اگر اس کے تعلیمی معیاروں ، اس کے عام حالات زندگی اور اس سے متعلق اس کا نقطہ نظر اور عصری تقاضوں سے جس قدر واقفیت ہوگی اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے ۔ یہ اور ایسی بہت سی باتیں مترجم کے کام کو دشوار بناتی ہیں ۔ لیکن یہ سب باتیں نصف حقیقتیں ہیں ۔ دنیا کے بہتر مترجم ان تمام خصوصیات پر پورا نہیں اترتے ۔ اگر یہ سب باتیں کسی ایک شخص میں مجتمع ہو بھی جائیں تو یہ کب ضروری ہے کہ لازمی طور پر وہ ایک اچھا مترجم بھی ثابت ہوگا ۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ترجمہ کیسا ہی تخلیقی کیوں نہ ہو آخر ترجمہ ہی ہوتا ہے ۔ ترجمہ کا کام اگرچہ بنیادی طور پر ترجمانی ہے لیکن اس سادہ لفظ سے حقیقت حال پوری طرح واضح نہیں ہوتی"۔

ہماری زبانوں کو ترجموں کی آج بھی ضرورت ہے ۔ ہمیں چاہیے کہ غیر ملکی معیاری ادب اور شہ پاروں کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی کوششوں کو بڑھائیں ۔ اچھے اور معیاری ترجمے کی ہمت افزائی کے لیے قیمتی انعامات دیں ۔ پاکستان بھر کے تمام اداروں میں ترجمے کے "سیل" قائم کریں ، ماہروں کا ایک ایسا بورڈ قائم کریں جو غیر ملکی زبانوں میں چھپی ہوئی کتابوں کی فہرست بنائے اور معیاری شہ پاروں کے تراجم کی سفارشات تیار کرے ۔

ایک جرنل بھی شائع کریں جس میں پاکستانی زبانوں میں شائع کیے کمپیوٹر مواد کا تقرر بھی شامل کیا جائے یہ کام نہ صرف غیر ملکی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کے سلسلے میں ضروری ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تمام پاکستانی زبانوں مثلاً سندھی ، پنجابی ، بلوچی ، پشتو ، بروھی

وغیرہ میں تحقیق شدہ یا تخلیقی ادب کو قومی زبان میں ترجمہ کرایا جائے اور اسی طرح قومی زبان میں شائع ہونے والے معیاری ادب کا پاکستانی زبانوں میں ترجمہ کرائیں تاکہ پاکستانی ادیب نہ صرف پاکستان سے باہر شائع ہونے والے ادب سے واقف ہوں بلکہ پاکستانی ادب سے بھی واقفیت رکھیں۔ یہ کام مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات پاکستان کا ہے اگر ان دونوں اداروں نے اس سلسلے میں کوئی کاوش کی تو ہم سمجھیں گے کہ انہوں نے پاکستان کی بڑی خدمت کی ہے۔

شکریہ

پہلی نشست

اصولی مباحث اور جائزے

صدارت	آفتاب احمد خان سیکریٹری عملہ ڈویژن۔
مہمان خصوصی	ڈاکٹر آفتاب احمد خان
ترجمے کے اصولی مباحث	مظفر علی سید
تبصرہ	پروفیسر رشید امجد
اردو زبان میں سائنسی وفنی تراجم کا جائزہ	طارق محمود
تبصرہ	ڈاکٹر اسلم فرخی
اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ	مرزا حامد بیگ
تبصرہ	ڈاکٹر سہیل احمد خان
گفتگو (بحث پہلی نشست)	ڈاکٹر ریاض مجید/اعجاز راہی

فن ترجمہ کے اصولی مباحث

مظفر علی سید

گوئٹے کا قول ہے کہ:

''جملہ امور عالم میں ، جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدرو قیمت رکھتی ہیں ، ان میں ترجمہ بھی شامل ہے''۔

لیکن گوئٹے کے مدنظر ، عالمی ادب کا ایک عظیم الشان نصب العین تھا اور جیسا کہ اقبال نے ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں لکھا ہے اس کے لیے مغرب و مشرق کا ادب انسانیت کا ایک مشترک سرمایہ تھا ۔ چنانچہ دانتے اور حافظ ، سوفوکلیز اور کالیداس میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں تھا ۔ ظاہر ہے کہ دیوان حافظ اور شکنتلا سے اس کی آشنائی ترجموں کے ذریعے ہوئی تھی جو زیادہ تر اس کے اپنے احباب نے کیے تھے ، یہی وسیع القلبی اور کشادہ نظری اس دور کے جرمن فلسفیوں میں نظر آتی ہے ، شوپن ہائر، ہرڈر بلکہ ہیگل تک میں جس نے ''جمالیات'' پر اپنے خطبوں میں فردوسی اور نظامی ، سعدی اور مولانائے روم کی طرف اہل مغرب کو توجہ دلائی ، ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان کے تراجم بھی جرمن زبان میں اور کسی حدتک فرانسیسی اور انگریزی میں ہو چکے تھے ، یہ تو نہیں کہ گوئٹے اور اس کے ہم خیال فلاسفر شغل ترجمہ کے خلاف اس قدیم تعصب سے نا واقف ہوں ، جس کے زیراثر ظریف لوگوں کے مترجمین کے بارے میں دلچسپ اور اختراانگیز جملے بنا رکھے تھے ، مثلاً Traditore Traduitore جسے انگریزی میں یوں کہا گیا ہے Translators are traitors اردو میں اس کا بدل ملنا بہت مشکل ہے ، لیکن عربی میں کہا جاسکتا ہے ان المترجمین مخربین اور فارسی میں شاید کوئی ایرانی یہ نعرہ لگائے ''ترجمہ داری تخریب کاری'' درحقیقت گوئٹے اور اس کے ساتھی ادبی ترجمے کے فن کو اعتبار دے

رہے تھے ، تقریباً اسی طرح جیسے جرمن زبان میں بائبل کا ترجمہ کرکے مارٹن لوتھر نے دیا تھا یا برطانوی بادشاہ جیمز اول کی تشویق و حمایت میں کام کرنے والے ان ۴۷ علما نے جو انگریزی میں ایک مصدقہ ترجمہ مرتب کرنے کا باعث بنے تھے -

دراصل یورپ میں مذہبی ترجمے کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی - سیفیہ (Septuagwt) کا یونانی ترجمہ ولادت مسیح سے پہلے ہوچکا تھا اور دوسری صدی عیسوی تک ''نیا عہد نامہ'' یعنی اناجیل و اعمال و مکاتیب کا یونانی متن بھی جس کے متعدد اجزا سریانی سے ترجمہ ہوئے ہوں گے ، تیار ہوچکا تھا - لیکن چوتھی صدی عیسوی میں مکمل بائبل کا مقابلتہً آسان لاطینی میں جو ترجمہ ہوا (جیسے Vulgate یا عام پسند کہا جاتا ہے) فن ترجمہ کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے ایک تو اس وجہ سے کہ یہ ترجمہ اس وقت کی مقبول عام زبان میں ، روز مرہ استعمال کے لیے کیا گیا اور دوسرے اس کے ممتاز مترجم سینٹ جیروم کو مذہبی تاریخ میں پہلی بار ولایت کے مرتبے پر فائز کیا گیا ، یہ الگ بات کہ بعد کے مترجمین میں سے لوتھر کو کلیسا سے خارج کیا گیا اور انگلستان کے ولیم ٹنڈیل کو شہید ترجمہ کا رتبہ نصیب ہوا - برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان جو عزت و تکریم خانوادہ شاہ ولی اللہ کو ملی ، اس میں بہت بڑا حصہ ان تراجم کا ہے جو شاہ صاحب اور ان کے لائق و فائق صاحبزادوں نے سپرد قلم فرمائے ، لیکن ترجمے کے سلسلے میں دونوں مذاہب کے درمیان اتنا فرق ضرور ہے کہ مسلمانوں نے متن سے جدائی قبول نہیں کی اور قرآنی تراجم کو لازمی طور پر متن کے بین السطور شائع کرنا ہی مناسب سمجھا -

مشرقی تہذیبوں میں ترجمے کی تاریخ مذہبی اور ادبی متون کے سلسلے میں کتنی قدیم ہے، اس موضوع پر کوئی تحقیق ہو چکی ہے تو کم سے کم میری نظر سے نہیں گزری - لیکن مغرب کی مثال سے یہ عمومی نتیجہ نکالنا شاید غلط نہ ہو کہ ترجمے کے فن کا مذہبی تبلیغ واشاعت کے علاوہ جدید زبانوں کی نشوونما اور قومیت کے شعور سے بہت گہرا تعلق ہے اور ان دونوں کا لازمہ ہے ، تعلیم طباعت کی ترقی اور معاشرے میں درمیانی طبقے کا عروج چنانچہ آج بھی تیسری دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے کہ

جہاں بھی تعلیم اور طباعت عام ہوتی ہے اور متوسط طبقہ کشمکش حیات میں شریک ہوتا ہے وہاں اور چیزوں کے علاوہ ترجمے کے فن کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے، اس لیے ترجمے کو کسی معاشرے کی روشن خیالی کا مظہر بھی کہا جا سکتا ہے -

(۲)

اور اب ترجمے کا لفظ - ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنے ہیں، ,, پارلے جانا ،، اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں ، یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے، عربی زبان سے آیا ہے اہل لغت اس کے کم سے کم چار معنے درج کرتے ہیں - ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام ، تفسیر و تعبیر ، دیباچہ اور کسی شخص کا بیان احوال یا تذکرہ شخصی ہے یہ سب معانی باہم مربوط ہیں - اس طرح ترجم بھی (ت کی پیش اور ج کی زبر کے ساتھ) جس کے معنے ہیں : التباس کرنا ، غلط ملط کرنا اور ترجم (ج کی زبر کے ساتھ) کا معنی ہے ، مشکوک اور مخلوط - غالباً یہ معنے آن بے احتیاط مترجمین کی وجہ سے پیدا ہوئے ہوں گے جن کی کسی زمانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور جو اپنی کثرت کی وجہ سے جملہ مترجمین کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، واضح طور پر سب معانی ثانوی اور مراوی ہیں کہ دن کا تعلق تاریخ کے نسبتاً متمدن ادوار سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ اصلی اور قدیم معنوں کے لیے مادے کو دیکھنا ہوگا اور اس کے دیگر مشتقات کو تاکہ لفظ ترجمہ کے گرداگرد ایک معنویاتی دائرہ کھینچا جا سکے ، یا زبان شناسی کی اصطلاح میں اس کو اپنے Semantic Fifld میں رکھ کر اس کی ماہیت معلوم کی جائے -

چنانچہ ابن منظور کی مبسوط تصنیف ''لسان العرب'' سے رجوع ناگزیر ہے ، جس نے لفظ ترجمہ کو ''ترجمان'' کے ساتھ سہ حرفی مادے ''رجم'' کے تحت درج کیا ہے (جب کہ بعض جدید لغات جیسے الفرائد الدریہ اس کو چار حرفی مادے ''ترجم'' کی ذیل میں لاتی ہیں جو عربی زبان کے

اصول اشتقاق کے مطابق نہیں ، جب تک اس کی بنیاد کسی دخیل کلمے پر نہ ہو غالباً عربی کے جدید علما لفظ ''ترجمان'' کو اساسی کلمہ سمجھتے ہیں ۔ یونانی لفظ Dragoman کی تعریب، اس طرح ترجمہ وغیرہ کو اشتقاق معکوس یا Back Formation کہا جا سکتا ہے ، ترجمے کو ''رجم'' سے منسوب کرنے میں بڑی دقت یہ ہے کہ اس کام کو گناہ کبیرہ کے ساتھ کیوں مربوط کیا جائے اور ہمارے مترجمین کو حد شرعی سے کیسے محفوظ کیا جائے ؟ بہر حال ابن منظور نے بھی جو اس مادے کے متعدد مشتقات درج کیے ہیں ، ان میں سے چند ایک کا معنوی رابطہ خود اس کی نظر میں واضح نہیں ۔ تاہم قتل اور سنگساری پتھر ، کنکری ، سنگ مزار، مزار موضع پہاڑ اونچی دکان اور مینار وغیرہ کا ''رجم'' سے تعلق سامنے کی بات ہے ۔ دوست اور بھائی اور مصاحب کے معنی جن پر کلاسیکی لغت نگاروں نے حیرت کا اظہار کیا ہے ، رجم سے زیادہ Dragoman کی سمت اشارہ کرتے ہیں مشتقات رجم کے ثانوی معنے با آسانی مادے سے مربوط ہو جاتے ہیں ، لعن طعن ، سب و شتم قذف بالغیب الزام و افترا ، قیاس و گمان ، اتہام اور فہم کلام (کلام مرجم) ۔ یہ آخری معنے ایک جگہ قرآن حکیم میں بھی دیکھے گئے ہیں اور ممکن ہے ''ترجمہ'' بطور اصطلاح اسی سے مستفاد ہو ۔ البتہ ایک سوال یہ ہے کہ شیطان کو کیوں ''رجیم'' کہا جاتا ہے ، لعنت کی وجہ سے ؟ (مرجوم باللعنہ) سب و شتم کی وجہ سے ؟ (مشتوم و مسبوب) ان کنکریوں کی وجہ سے جو مناسک حج کے دوران جمعرات کو ماری جاتی ہے (مرجوم بالحجارۃ) یا شہاب ثاقب کی وجہ سے جو اس پر گرتے ہیں (مرجوم بالکواکب ۔ وجعلنا ھار جوماً للشیاطین) خود شہاب ثاقب کو رجوم کہا جاتا ہے کہ نجوم و کواکب سے الگ ہو کر کہیں نہ کہیں یا کسی نہ کسی کو جا لگتے ہیں ۔

ترجمے کا تعلق ۔ اصل تصنیف سے تقریباً وہی ہے جو شہاب ثاقب کا نجوم و کواکب سے ہوتا ہے ، یہ بھی اکثر اوقات ایک نہ ایک سیارے سے جدا ہو کر تاریخ کے کسی نہ کسی ریگستان میں گم ہو جاتا ہے یا پھر اپنی اصل کے دائرہ کشش ثقل میں گردش کرتے کرتے خود بھی ایک چھوٹا موٹا سیارہ بن جاتا ہے جیسا کہ فن ترجمہ کی تاریخ میں

کئی بار ہو چکا ہے پھر جس طرح ایک ہی سیارے سے مختلف وقتوں میں ایک سے زیادہ شہاب ثاقب نمودار ہو سکتے ہیں ۔

اسی طرح مختلف ادوار ادب میں ایک ہی کلاسیکی کارنامے سے بار بار نئے ترجمے نمودار ہوتے ہیں ۔ بلکہ کلاسیک تو کہتے ہی اس کارنامے کو ہیں ۔ جس کے ترجمے کی بار بار ضرورت پڑے اور جیسے کوئی بھی شہاب ثاقب حتمی اور آخری نہیں ہوتا ، اسی طرح کسی بھی ترجمے کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا ، ان ترجموں کو بھی نہیں ، جن کو اپنے زمانے میں تخلیق تک سے بہتر کہا گیا ہو ۔

مارسل پروست نے اپنے عہد آفریں ناول ''گم شدہ وقت کی تلاش'' کے انگریزی ترجمے کو اصل فرانسیسی کے فزوں تر کہا تھا ۔ لیکن نصف صدی کے بعد اس کا نئے سرے سے ترجمہ کرنا ضروری محسوس ہوا ۔ اسی طرح لاطینی امریکہ کے مشہور ادیب گابرئیل گا رسیا مارکیز نے اپنا زور دار ناول ''ایک صدی ، تنہائی کی'' انگریزی زبان میں پڑھا تو اسے اصل اسپانوی زبان کی نسبت قابل ترجیح سمجھا لیکن خراج تحسین منکسر مزاج مترجم گریگری راسا کے خیال میں انگریزی زبان کو ملنا چاہیے کہ جملہ تراجم کی طرح ایک نہ ایک دن یہ ترجمہ بھی متروک ہو جائے گا ، بالکل ایسے جیسے ''ڈون کو ہگزوٹ'' کو اصل اسپانوی زبان میں پڑھا جائے تو تقریباً چار صدیاں پہلے کا یہ ناول آج بھی نسبتاً جدید محسوس ہوتا ہے لیکن سروینٹس کے معاصرین نے اس کے جو ترجمے کیے تھے ، اب خوف ناک حد تک فرسودہ لگتے ہیں ۔ اس لیے کہ شہاب ثاقب کی طرح ، ہر تازہ ترجمہ ، لوگوں پر ایک نئے سرے سے اثر انداز ہوتا ہے ۔

غرض کہ ترجمے کا کوئی نہ کوئی رابطہ ''رجم'' سے قائم کیا جا سکتا ہے بلکہ اسی وجہ سے ترجمے کا فن بہت سے ظریفانہ اقوال کا ہدف بنتا ہے ۔ جیسے من ترجم یرجم (جس نے ترجمہ کیا ، سنگسار ہوا)

(۳)

''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے''

یہ خیال تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ نے اپنی عمدہ تصنیف ''مقدمہ ادب عالم'' میں ظاہر کیا تھا لیکن ساتھ ہی بڑی درد مندی سے یہ ٹھوس حقیقت بھی تسلیم کی تھی کہ:

''ترجمہ نام ہے ایک سعی نا مشکور کا جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے''۔

یہ فقرہ آج سے کوئی ۵۰ برس پہلے لکھا گیا تھا - جب کہ نوبل انعام اور دوسرے بین الاقوامی امتیازات کے خواہش مند ادیب، مترجمین کی تلاش میں سرگرداں نہیں پھرتے تھے اور نہ عالمی ادب کے تراجم مقبول عام پیپر بیک ایڈیشنوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ تاہم دیکھا جائے تو اب بھی صورت حال میں نہایت معمولی سا فرق پڑا ہے۔ شاید ترجمے کا معاوضہ پہلے سے زیادہ ہو گیا ہو اور مترجم کا نام اب کتاب کے سرورق پر بھی چھپنے لگ گیا ہے۔ اس کے علاوہ تقابلی ادبیات کا مطالعہ دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں ہونے لگا ہے۔ (چنانچہ ''پاکستانی ادب بشکل ترجمہ'' ایک مضمون کے طور پر امریکہ اور کناڈا میں پڑھایا جا رہا ہے) ترجمے کا عام معیار بھی غالباً پہلے سے بہتر ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود، کم سے کم تیسری دنیا میں، جہاں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے - ترجمے کو اب تک حقارت کی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی حقیر کام کم سے کم مغرب میں ایسے لوگوں نے بھی انجام دیا ہے - جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو تھے - انگریزی میں چوسر سے لے کر ڈرائیڈن، پوپ، کولرج اور براؤننگ تک اور بیسویں صدی میں لارنس، ژیٹس، پاونڈ، ایلیٹ، آڈن اور بیکٹ تک نے یہ کام کیا ہے۔ فرانسیسی میں بودیلیئر سے لے کر آندرے ژید تک کتنے بڑے فنکاروں نے خود کو مترجم کہلانے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی - (بلکہ ژید نے تو یہاں تک کہا ہے - کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شہکار اپنی زبان میں منتقل کرے) - جرمن زبان میں گوئٹے کے علاوہ شلر اور روسی زبان میں پاسترناک کے تراجم کی اہمیت مسلم ہے - (گوئٹے نے آٹھ دس زبانوں سے ترجمہ کیا ہے اور پاسترناک کو شیکسپیئر کے عمدہ ترین مترجمین میں شمار کیا جاتا ہے) - پھر یہ بھی نہیں کہ اتنے بڑے لکھنے والوں نے یہ کام محض پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا ہو یا اس کو لڑکپن کا ایک مرحلہ تربیت سمجھا ہو انھوں نے تو اپنی اپنی شخصیت کو اور شہرت کو داؤں پر لگا کر یہ کام کیا ہو -

بیسویں صدی کے اردو ادب میں، پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے لیکر اختر حسین رائپوری، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، قرۃالعین حیدر اور انتظار حسین نے نثری ادب کا ترجمہ کیا ہے اور اقبال سے لیکر فیض، راشد، فراق، میراجی، مجید امجد اور شان الحق حقی جیسے شاعروں نے شعری ادب کے تراجم کیے ہیں - ان میں کون ہے - جس نے کسی بھی دوسری شخصیت کا ضمیمہ بننا قبول کیا ہو - تا ہم اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیقی ادب کے مقابلے میں، ترجمے کا کام، نفی خودی کا مظہر ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ پھر یہ کام اثبات خودی کے پیغمبر حضرت علامہ نے کیوں انجام دیا! شاید اس لیے کہ اسرار خودی سے ہی نہیں رموز بیخودی سے بھی ان کا رشتہ اتنا ہی گہرا تھا -

کہا جاتا ہے کہ دنیائے اول کا اصول حیات، انفرادیت پرستی اور دنیائے دوم کا فلسفۂ زندگی اجتماعیت پرستی ہے لیکن اس کے باوجود مغربی یورپ اور امریکہ میں علمی، ادبی اور اجتماعی ادارے صدیوں سے چل رہے ہیں اور مشرقی یورپ اور روس میں انفرادی کمال اور تخلیقی امتیاز کا حصول ناممکن نہیں - اس کے برعکس تیسری دنیا میں نہ انفرادی جوہر درجہ کمال تک پہنچنے پاتا ہے، نہ تہذیبی تعاون کی صورت پیدا ہوتی ہے - بلکہ دونوں کی جگہ ایک ناپختہ انانیت پسندی کا دور دورہ ہے - ایسے میں ترجمے کا کام، کسی اعلیٰ پیمانے پر، کہاں سے ہو؟ ترجمے کا تو اصل الاصول ہی تعاون ہے - مصنف کے تعاون، قاری کے تعاون، اصل زبان کے تعاون، اپنی زبان سے تعاون، موضوع کتاب کے خصوصی، ماہرین سے استمداد بلکہ مختلف قسم کے پیشوروں کے تعاون کا حصول بھی لازم ہے - تاکہ عمومی سطح پر استعمال ہونے والے اصطلاحی الفاظ کا زندہ مفہوم سمجھ میں آئے - ورنہ علم و ادب کا رابطہ زندگی سے کٹ کر رہ جائے گا - چنانچہ ترجمہ ایک نہایت مشقت طلب کام ہے اور جو طبیعتیں اس کے خلاف تعصب اور مزاحمت سے کام لیتی ہیں، درحقیقت محنت سے جان چراتی

ہیں۔ ایسے میں تخلیقی الہام اور آمد پرستی سے بہتر بہانہ کون سا ہو سکتا ہے۔

ترجمہ ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں۔ جورج سٹائنز کا کہنا ہے کہ ۹۰ فیصد تراجم ناقص ہوتے ہیں (اور طبعزاد تحریریں کتنے فیصدی ناقص نہیں ہوتیں؟) پھر ترجمے کی بہت سی اقسام ہیں کہ یہ کام تو بازار سے لیکر اقوام متحدہ تک اور اخبار سے لیکر وی سی آر تک کسی نہ کسی شکل میں چلتا ہی رہتا ہے۔ چاہے محض چالو قسم کا ہو۔ عام زندگی میں بھی ترجمے کا معیار قدرے بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو فن کے طور پر نہ سہی، ایک روزمرہ ہنر کی طرح سے ہی سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کیا جاسکے۔ فن کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ محض تعلیم و تعلم سے نہیں آتا، اگرچہ اس میں بھی ایک عنصر ہنر کا ضرور ہوتا ہے جو ماہرانہ تربیت سے نکھر سکتا ہے۔ لیکن ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان تو خیر آنی ہی چاہیے۔ اس موضوع کے بھی طبعی مناسبت درکار ہے۔ جو متن میں موجود ہے، مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور اس صنف ادب یا شاخ علم سے بھی، جس سے متن پیوست ہے۔ مترجم کو پیوستگی حاصل ہو، تب شاید ترجمہ چالو معیار سے اوپر اٹھ سکے۔

تاہم ترجمے کی زیریں انواع میں اتنی ساری شرائط کا اجتماع نہیں ہوتا۔ مثلاً تعلیمی اور تکنیکی ترجمہ بلکہ علمی ترجمہ بھی مصنف کی شخصیت اور مترجم کی پیوستگی پر اصرار نہیں کرتا۔ تاہم اس قسم کا ترجمہ بھی، لسانی اور علمی (یا تعلیمی اور تکنیکی) اہلیت سے بے نیاز رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیمی اور تکنیکی ترجمے کے بارے میں البتہ ایک صراحت ضروری ہے کہ جس چیز کو علمی ترجمہ کہا جاتا ہے۔ یعنی نظریاتی علوم، ان کی تاریخ طرز فکر اور طریق کار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا، اس کے بغیر تعلیمی اور تکنیکی ترجمہ ایسے ہے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی کو درآمد کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے بے پروا ہو کر کہ آپ کا معاشرہ اس ٹیکنالوجی کو جذب بھی کر سکے

گا یا نہیں۔ درحقیقت جب تک کسی معاشرے میں ایک عمومی آگہی کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک اجتماعی سطح پر کوئی علمی سرچشمہ وجود میں نہیں آتا۔ تب تک ٹیکنالوجی کے خریدار، خریدار ہی رہتے ہیں۔ اس کے تولیدکار نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو نظام تعلیم، تحقیق ترقیاتی (آر اینڈ ڈی) اہلیت رکھنے والے افراد پیدا نہیں کر سکتا، محض رسمی تعلیم اور رسمی نصاب کے ذریعے چاہے وہ کسی زبان میں ہو دور رس نتائج کا حامل نہیں ہو سکتا۔ نصابی کتب کا ترجمہ اور طباعت، ناشرین کے سپرد ہو، تب بھی ان میں مطابقت اور ہم آہنگی کسی نہ کسی قومی ادارے کی ذمہداری تو ہو گی۔ اس سے زیادہ نظریاتی علوم کی بنیاد جن فکری تصانیف پر ہے۔ ان کا ترجمہ تعلیمی اور تکنیکی ترجمے کے لیے ایک ایسی بنیاد فراہم کرے گا۔ جس کی روشنی میں نصابی تراجم کا معیار بھی ترقی کر سکتا ہے۔

(۴)

ترجمے کی دو انواع البتہ ایسی ہیں۔ جن کے مقصد منہاج میں بظاہر شدید مخالفت کی صورت حال پیدا ہو سکے۔ یہ ہیں مشینی ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ۔ مشینی ترجمے کا مقصد ہے انسانی زبانوں میں باہمی ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا تاکہ تعلیمی اور تکنیکی، معلوماتی اور تبلیغاتی مسالہ کم سے کم وقت میں تیار ہو سکے۔ ربع صدی پہلے جب ایک ''خود کار مترجم'' تیار کرنے کے لیے ابتدائی تحقیق شروع ہوئی تھی تو یہ توقع پورے جوش و خروش سے کی گئی تھی کہ جلد ہی ایک ایسا آلہ ایجاد ہو جائے گا جس کے ایک طرف کسی زبان کا متن داخل کیا جائے تو دوسری طرف سے مطلوبہ زبان کا ترجمہ کھٹ سے باہر نکل آئے گا۔ اس دوران میں جدید زبان شناسی کے ماہرین نے مختلف زبانوں کے اجزائے ترکیبی کا تقابلی مطالعہ کرکے واضح کر دیا ہے کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں۔ چنانچہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کمپیوٹر میں لسانیاتی پروگرام بھرنے کے بعد بھی لسانی ماہرین کی ضرورت برقرار رہے گی اور وقت اور سرمائے کی بچت شاید پھر بھی نہ ہو سکے۔ تاہم دنیا کے کئی ملکوں میں مزید تحقیق جاری ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ پوری طرح خود کار نہ سہی مشینی ترجمہ کسی قدر آسان ضرور ہو جائے

گا تاہم اس کا دائرہ کار ایسی زبان تک محدود رہے گا جس میں زبان کو تہ در تہ معنویت کے ساتھ استعمال نہ کیا گیا ہو اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ تو ہوتا ہی ایسی تخلیقات کا ہے جو تہ در تہ معنویت کی حامل ہوں اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن قسم ہے یہاں تک کہ تاریخِ ادب میں متعدد تخلیقی فن کاروں نے اسے کلیتہً خارج از امکان قرار دے دیا ہے۔ رابرٹ فراسٹ کا جملہ مشہور ہے کہ شاعری اس چیز کا نام ہے جو ترجمہ سے باہر رہ جائے شیلی کے نزدیک ترجمہ کرنا ایسا ہے جیسے کسی پھول کو کیمیاوی تجزیے کا ہدف بنانا لیکن شیلی کا شمار خود اپنی زبان کے عمدہ ترین مترجمین میں ہوتا ہے ہمارے زمانے کے ایک ممتاز مترجم (جے۔ ایم۔ کوئین) کے خیال میں تو شیلی کے تراجم ہی سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شاعر کسی ایسے متن کو منتخب کرے جو اس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو۔ تو فن ترجمہ کیسی بلندیوں تک جاسکتا ہے ان ترجموں میں فاؤسٹ کے اجزا بھی شامل ہیں اور فاؤسٹ کو ناقابل ترجمہ کیا جاتا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عالمی ادب میں جس فن کار نے ترجمے کے فن کو اعتبار بخشا خود ذاتی اور انفرادی احساس کی اہمیت سب سے مافوق ہے لیکن یہ امکانات کہاں تک جاسکتے ہیں اس کا اندازہ ترجمے کی مشکلات کی فہرست بنا کر نہیں ہو سکتا ، اس لیے کہ تخلیقی ترجمہ ایک ایسے اتفاق حادثے کا نام ہے جس کی پیش بینی نہیں ہو سکتی یہ تو ٹھیک ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بلفظ مماثلت نہیں ملتی جو بامعنی بھی ہو اور درست بھی تاہم تخلیقی ترجمے کرنے والوں نے صرف ایسی مماثلتیں دریافت کی ہیں بلکہ جہاں نہیں بھی تھیں اپنے تخیل سے پیدا کرکے دکھا دی ہیں چنانچہ ترجمے کی یہ قسم آزادی اور پابندی کے درمیان ایک جدلیاتی کشمکش کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب یہ تضاد اعلیٰ سطح پر موافقت اور مطابقت کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو فن ترجمہ کی رسائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن عام قسم کا لفظ بلفظ ترجمہ جس میں اصل زبان کی زندگی مفقود ہو ، یا ایسا رواں دواں اور آزاد ترجمہ جس میں اصل کی تہ در تہ معنویت قربان ہو جائے فن ترجمہ کی مشکلات سے نا آشنائی یا دانستہ گریز کا مظہر ہے۔ یہ گویا ترجمے کے جدلیات سے آسانی کا ایک راستہ نکالنے کی

کوشش ہے۔ ہمارے یہاں محمد حسن عسکری مرحوم نے اس قسم کے رواں ترجمے کو جس میں اصل متن کے اسلوبِ بیان کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہو اور اس کی جگہ کوئی مماثل اور متوازی اثر پیدا کرنے کی کوشش بھی نہ کی گئی ہو عالمی ادب کی یا اپنی زبان کی کوئی خدمت تسلیم نہیں کرتا اصولی طور پر ایسے ترجموں کو تلخیص یا تسلی کی ایک مشق تو سمجھا جا سکتا ہے کوئی تخلیقی کمال نہیں سمجھا جا سکتا دراصل تخلیقی سطح کا ہر ترجمہ اپنے ساتھ ایک نیا مسئلہ لے کر آتا ہے کیونکہ اس کا رابطہ ایک ایسے متن سے ہے جو اپنی زبان میں ایک مثالی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

عسکری صاحب نے ایک جگہ فرانسیسی ناول ''سرخ و سیاہ'' کے ترجمے میں مصنف سے بے وفائی کی معذرت کی ہے۔

وفا یوں بھی لازم و ملزوم نہیں ہوتے چنانچہ فرانسیسی زبان میں کہا گیا ہے۔ (انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو۔)

> Translations are like women : when they are faithful, they are not beautiful, when they are beautiful they are not faithful.

آخر میں دو ایک باتیں ترجمے اور تہذیب کے ربط باہم پر—ترجمے کا فن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطہ نظر کی پیداوار بھی ہے اور ایک بین الاقوامی انداز نظر پیدا کرنے کا وسیلہ بھی۔ بشریات کے عالم مالینوسکی نے اس کو تہذیبی سیاقتوں کے اتحاد کا نام دیا ہے لیکن ایک تو کوئی بھی اتحاد یک طرفہ نہیں ہو سکتا دوسرے زبان کی سرحدوں کو پار کرکے مفاہمت باہم کی فضا پیدا کرنا کوئی آسان کام بھی نہیں عربی تعریف کے مطابق ترجمہ ''نقل کلام'' کو کہتے ہیں۔ نقل مطالب یا نقلِ معانی کو نہیں اور ''نقلِ کلام'' کا تقاضا یہی ہے کہ جس زبان میں نقل ہو جائے اس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں ہوا تھا اور یہ بھی لازم ہے کہ کلام سے مکالمے کی صورت پیدا ہو ورنہ ترجمے کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔

دو طرفہ اثر ، یعنی اثر پذیری اور اثر انگیزی کی مثال ہے [illegible]

علوم کی منتقلی مسلمانوں میں مسلمانوں کے علوم کی منتقلی یورپ میں جو حران کے نصاریٰ اور اندلس کے یہودیوں کی وساطت سے ہوئی آج ہم جملہ علوم و فنون درآمد کرنے پر لگے ہوئے ہیں اور شاید یہ بھی سمجھتے ہوں کہ تہذیبی سطح پر ہمارے پاس برامد کی کوئی چیز نہیں اگر سچ مچ ایسا ہو پھر تو ہم کسی دوسری تہذیب کے تخلیقی کارنامے کو اپنی زبان اور اپنی تہذیب میں جذب بھی نہیں کر سکتے۔ بین الاقوامیت قومی کی نفی نہیں، اقوام عالم کے درمیان افہام و تفہیم پیدا کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح ترجمہ بھی اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے تشخص کو اور اس کی اجتماعی خودی کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ اسی کی تعمیر و ترقی کے لیے یہ ساری مشقت قبول کی جاتی ہے۔

چنانچہ جذب و انجذاب کی یہ کشمکش جب تک ترجمے میں جلوہ گر نہیں ہوتی اس وقت تک ترجمے کی کوئی تہذیبی اہمیت نمودار نہیں ہوسکتی۔ ترجمے سے خوف زدہ ہونے کی بجائے ہمیں تو اس تنگ نظری سے خوف زدہ ہونا چاہیے جو اثر انگیزی کا دعویٰ تو رکھتی ہے لیکن اثر پذیری کو حرام سمجھتی ہے۔

اور اب خاتمہ کلام کے طور پر ''گوئٹے'' کا ایک اور اقتباس:

> ''ہمارے مترجمین اپنی زبان کے محاورے کا بے حد احترام کرتے ہیں اصل کارناموں کی روح کو گرفت میں لانے سے کہیں زیادہ کسی مترجم کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کی موجودہ حالت کو برقرار رکھنے پر مصر ہے اور اس کو غیر زبان سے کوئی زور دار اثر قبول نہ کرنے دے، لازم ہے کہ ہر زبان کی مدد سے اپنی زبان میں وسعت اور گہرائی پیدا کی جائے ابھی تک صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا کہ یہ بات کہاں تک ممکن ہے اور کوئی بھی زبان کی حد تک اپنی ہیئت کو مبدل کر سکتی ہے لیکن ترجمے کے ذریعے یہ کوشش جاری رکھنا ہر مترجم کا فرض منصبی ہے۔''

فن ترجمہ کے اصولی مباحث

پروفیسر رشید امجد

ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں لیکن جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے، جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے، چنانچہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے، اسے گلوبل علم سے واقف کرنے اور جدید ٹیکنالوجی کا ساتھ دینے کے لیے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔ سید صاحب[1] نے اپنے مضمون میں اس ضرورت کی اہمیت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ترجمے کی مختصر تاریخ، لفظ ترجمہ کا پس منظر اور ترجمے کے فن پر بھی بحث کی ہے۔

سید صاحب نے اپنی بات گوئٹے کے اس قول سے شروع کی ہے کہ ترجمہ عالمی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔ کہ اس کے ذریعے صرف زبان کی سطح پر ہی انسانی علوم میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ ذہنی کشادگی کے ذریعے بعض اوقات معاشرے کے بنیادی مزاج اور رہن سہن میں بھی ایک تغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ترجمے کا دائرہ صرف ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام انسانی علوم اور دریافتیں اس میں شامل ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ علم یا دریافت کسی قوم کی میراث نہیں ہوتی، بلکہ پوری نسل انسانی اس سے استفادہ کرتی ہے تو اس کا وسیلہ دراصل ترجمہ ہی ہے، جس کے ذریعے قومیں عالمی تناظر میں نہ صرف ایک دوسرے کے جذبات و احساسات میں شریک ہوتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کے علمی اور تحقیقی کاموں سے بھی فیض حاصل کرتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی زبان میں ترجمے کی اہمیت سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا اور اس بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ ترجمے کا فن اپنے عصر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا عمل ہے اور سید صاحب کی یہ

۱۔ مظفر علی سید۔

رائے بہت درست ہے کہ ترجمہ کسی معاشرے کی روشن خیالی کا مظہر ہے۔

سید صاحب نے بڑی تحقیق اور حوالوں سے لفظ ترجمہ کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اس لفظ کے عربی تناظر اور دوسری صورتوں کا ذکر کرکے اس کے عہد بہ عہد تاریخ بیان کر دی ہے۔ یہ تحقیقی بحث اپنی جگہ اہم ہے لیکن اصل مسئلہ ترجمہ کے فن سے تعلق رکھتا ہے۔ سید صاحب کا یہ کہنا کہ ''ترجمہ ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں'' درست ہے۔ اب بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اگر ہم ترجمے کی ان دو صورتوں پر غور کرلیں تو آسانی ہوگی۔

اول : تخلیقی ترجمے۔

دوم : غیر تخلیقی ترجمے۔

تخلیقی ترجمے سے مراد ادبی اور تخلیقی تحریروں کے تراجم ہیں اور ان ہی پر سب سے زیادہ اختلافی باتیں ہوتی ہیں کیونکہ سائنسی یا علمی موضوعات کا ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحوں پر تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مفہوم کی ترسیل میں فرق نہیں پڑتا ، لیکن ادبی ترجموں میں اصل جھگڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ اعتراض کیا جائے کہ لکھنے والے کا اصل مفہوم یا تحریر کا مزاج تو ترجمے میں آیا ہی نہیں ، پھر اصناف کی باریک بینیاں بھی اکثر ترجمے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کے برعکس غزل کا ترجمہ کہیں مشکل ہے کہ غزل کے خیال کو تو آسانی سے دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی مزاجی کیفیت اور ہیئتی دبازت کو ترجمہ کرنا آسان نہیں۔

شاید یہ بات ٹھیک ہو کہ ترجمے کے ذریعے ہم اصل تک پہنچ سکتے ہیں لیکن اصل کو بعینہٖ اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے ، لیکن یہ بھی کوئی کلیہ نہیں اور سید صاحب کی اس بات سے ہی اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات ترجمہ اصل سے آگے نکل جاتا ہے۔ تو گویا بات ہیر پھیر کر ترجمہ کرنے والے کی مہارت ، دونوں پر زبانوں پر اس کی گرفت اور سب سے بڑھ کر اصل چیز یا مصنف سے اس کی جذباتی وابستگی پر آ جاتی ہے۔

ترجمے کی حتمی تعریف شائد ممکن نہیں۔ کچھ لوگ خیال کی منتقلی ہی کو کافی سمجھتے ہیں لیکن کچھ لوگ ہیئت اور اسلوب پر بھی زور دیتے ہیں لیکن کیا اسلوب کی خوبصورتی اور دبازت کو دوسری زبان میں منتقل کیا بھی جا سکتا ہے ؟ ترجمے میں خیال اور زبان دونوں ہی کو اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے لفظوں میں ''ترجمے کی اہمیت یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں اور دوسری طرف زبان کی قوتِ اظہار میں نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں'' جیلانی کامران اسے انسانی علوم میں اضافے اور ذہنی سرحدوں کو کشادہ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن اصل معاملہ طریقہ کار کا ہے کہ کسی ترجمے کی معیار بندی کن اصولوں پر کی جا سکتی ہے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ صحیح ہو ، عام فہم ہو اور خوبصورت ہو ، لیکن بات وہیں ہے کہ یہ تینوں شرطیں کیسے پوری ہو سکتی ہیں۔ اچھے اور برے ادبی ترجموں کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ، لیکن جس طرح تخلیقی معاملات اور مراحل میں کسی اصول اور ضابطے کی پابندی ممکن نہیں اور ایک قسم کے تخلیقی عمل کو دوسری طرح کے تخلیقی عمل کے تابع نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ترجمے کے لیے لاکھ اصول بنائے جائیں ، ہر ترجمہ اپنا ایک علیحدہ ضابطہ لے کر آتا ہے اور یہ ترجمہ کرنے والا ہی جانتا ہے کہ وہ کس طرح اصل سے انصاف کر سکتا ہے اور جیساکہ کہا گیا ہے بنیادی بات یہ ہے کہ جسے اور جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کے ساتھ ترجمہ نگار کی جذباتی اور علمی واقفیت کتنی اور کس سطح کی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ترجمہ کرنے والے کے مزاج کے سلسلے میں اس بات کو ضروری قرار دیا ہے کہ اس کے مزاج میں ایک اطاعت ہو تاکہ وہ متن سے اتفاق کر سکے اور یہ انکساری کے بغیر ممکن نہیں۔ سید صاحب مصنف سے اس جذباتی اور علمی واقفیت یا متن کے اتفاق کو موضوع سے طبعی مناسبت اور مصنف سے نفسیاتی مماثلت کہتے ہیں ، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو اس صنف ادب یا شاخ علم سے بھی واقف ہونا چاہیے جس میں متعلقہ متن موجود ہے۔ ورنہ ترجمہ عام معیار سے اوپر نہیں اٹھ سکے گا۔ یہاں سید صاحب دراصل یہ نکتہ پیدا کر رہے ہیں کہ اعلیٰ ترجمہ دراصل ایک طرح کا تخلیقی عمل ہی ہے کہ تخلیقی فنکار تخلیق کے دوران

جس کرب سے گزرتا ہے اور عمدہ تخلیق کے لیے جس علم ، مشاہدے اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ، ترجمے کے لیے بھی انھی کیفیتوں اور فنی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مصنف کے تخلیقی عمل کی پیچیدگی تک رسائی کرکے اس کے سارے نفسیاتی عمل کو سمجھنا پڑتا ہے ، اسی لیے سید صاحب ترجمے کے فن کو خاصا پیچیدہ معاملہ سمجھتے ہیں کہ اس میں دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے ۔

کاروباری تراجم کا معاملہ تو خیر بہت مختلف ہے ، البتہ غیر تخلیقی تراجم جن میں فلسفہ، صحافت ، نفسیات اور دوسرے علوم شامل ہیں ، محنت کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی معیار بندی کا تقاضہ بھی کرتے ہیں کہ ان میں اگرچہ زبان اور فن کی نزاکتوں کا زیادہ خیال نہیں رکھنا پڑتا ، لیکن مفہوم کی صحت بہت اہم ہوتی ہے ۔ بقول جیلانی کامران "غیر ادبی تصانیف کا ترجمہ دراصل ایک زبان کی لسانی موت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری زبان کی لسانی افزائش کا باعث بنتا ہے" یہ بات درست ہے کہ اس طرح کے ترجمے میں ہم ایک زبان کے مقابلہ میں دوسری زبان میں اضافہ کر رہے ہوتے ہیں ۔ اس قسم کے سائنسی یا علمی ترجموں میں زبان اور اسلوب کی نزاکتوں کی بجائے مفہوم سے دلچسپی ہوتی ہے ۔ ایسے ترجموں میں اصل مشکل اصطلاحوں کا وضع کرنا ہے اور یہ کام انفرادی سے زیادہ اجتماعی ، بلکہ ایک ایسے مجاز ادارے کا ہے جو اصطلاحوں کی مجموعی معیار بندی کے ساتھ ساتھ مفہوم کی صحت کا بھی خیال رکھے ۔

سید صاحب نے اپنے مضمون میں ترجمے اور اس کے فن کے بارے میں بہت عمدہ باتیں کی ہیں ، ان کے مقالے کا بنیادی سوال تین حصوں میں تقسیم ہے ۔

اول : ترجمہ کی اہمیت کیا ہے ؟

دوم : اچھے ترجمے کی پہچان کیا ہے ؟

سوم : ترجمے کے اصول کیا ہیں ؟

لیکن اگر ہم ترجمے کو تخلیقی عمل کا متبادل سمجھتے ہیں تو کیا اسے کسی اصول اور ضابطے کا پابند کیا جا سکتا ہے ؟

اردو کے سائنسی اورفنیاتی تراجم کاجائزہ

طارق محمود

اردو میں علمی اور فنی تراجم کا ذکر آتا ہے تو ذہن عام طور پر سب سے پہلے انگریزی نگارشات کے اردو تراجم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں علمی تراجم کا کام ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں شروع ہوا تھا ۔ گویا اردو زبان میں ترجمہ کی تاریخ ڈیڑھ ہونے دو سو برس سے زیادہ پرانی نہیں ۔ لیکن اگر انگریزی کے علاوہ عربی اور فارسی سے تراجم کو بھی شامل کر لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو میں ترجمہ کا کام لگ بھگ چار سو برس سے پہلے شروع ہو چکا تھا ۔

اردو زبان میں ترجمہ کا آغاز فارسی سے ہوا ۔ یہ کام سلطنت بیجاپور میں ہوا تھا جہاں حکومت رائج الوقت فارسی کی جگہ مقامی زبان کی سرپرستی کر رہی تھی ۔ اگرچہ یہ تراجم علمی یعنی سائنسی اور فنی نوعیت کے نہیں تھے اور اس لحاظ سے ہمارے موضوع میں شامل نہیں ہیں ، تاہم عام دلچسپی کے لیے ان کا مختصر ذکر کروں گا ۔ سب سے پہلا ترجمہ ملک خورشید نے ۱۰۵۶ھ میں امیر خسروؒ کی "مثنوی ہشت بہشت" کے ایک جزو کا اور دوسرا ترجمہ ۱۰۸۱ھ میں طبعی نے نظامی گنجوی کی مثنوی "ہفت پیکر" کا "بہرام وگل اندام" کے نام سے کیا۔

اس زمانے اور خاص طور پر بعد کے مغلیہ دور کے مسلمانوں کی علم دوستی کے پیش نظر یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ شاعری کے علاوہ دیگر مضامین کی عربی اور فارسی کتب کا بھی ترجمہ ضرور ہوا ہوگا ۔ لیکن آج ان تراجم کے (اگر یہ واقعی ہوئے تھے) آثار موجود نہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں چھاپے خانے نہیں تھے اور کتابوں کی قلمی نقلیں تیار ہوتی تھیں ۔ بعد میں جب ہاتھ سے چلنے والے چھاپے خانے قائم

ہوئے تب بھی کتابوں کی تعداد اشاعت زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی سو ہوتی تھی - عبداللہ قدسی نے اور موضوعات کے علاوہ فلسفہ و منطق کے ۱۰۰ ، مختلف علوم و فنون کے ۵۰۰ اور لغات و لسانیات کے ۱۰۰ تراجم کا ذکر کیا ہے - یہ باور کیا جاتا ہے کہ ان میں سے خاصے تراجم ابتدائی اور درمیانی مغلیہ دور کے ہوں گے - قدسی صاحب نے لکھا ہے کہ :

"عربی ، فارسی سے اردو میں جس قدر کتابوں کے تراجم ہوئے ہیں ، ان کا زمانہ اس زمانے سے جتنی دور ہے اسی قدر وہ ترجمے مستند ہیں"۔

جہاں تک انگریزی سے اردو میں ترجموں کا معاملہ ہے تو اس کی تاریخ ڈیڑھ ہوئے دو سو برس سے زیادہ کی نہیں - اس سلسلے میں اداروں کے نام بھی آتے ہیں اور افراد کے بھی - افراد میں نواب شمس الامرا اور شاہ اودھ کا نام لیا جاتا ہے اور اداروں میں فورٹ ولیم کالج ، دہلی کالج (۱۸۲۱ء تا ۱۸۵۷ء) ، سائنٹفک سوسائٹی (۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۷ء) رڑکی انجینئرنگ کالج (۱۸۵۶ء تا ۱۸۸۸ء) ، انجمن پنجاب (۱۸۸۰ تا ۱۹۰۰ء) ، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ ، حیدر آباد دکن (۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۸ء) کا نام سر فہرست ہے ۔ دور جدید میں یعنی پاکستان کے قیام کے بعد جن اداروں نے اردو تراجم کے کام کا بیڑہ اٹھایا ان میں اردو کالج ، انجمن ترقی اردو ، سائنٹفک سوسائٹی پاکستان (جو سرسید کی قائم کردہ مذکور الصدر سائنٹفک سوسائٹی کی جانشین ہے) ، کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، پنجاب اور فیصل آباد کے تصنیف و تالیف و ترجمہ کے شعبے ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، کراچی اور بہت سے تجارتی ناشر اداروں کے علاوہ مقتدرہ قومی زبان شامل ہیں -

اس جائزہ میں اُن تمام اداروں کے کاموں کا اجمالی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سایہ فورٹ ولیم کالج میں اردو میں علمی تراجم کے کام کا آغاز قانونی کتب کے تراجم اور قانونی فرہنگوں کے ترتیب و تدوین سے ہوا - اگرچہ قانون کا موضوع شاید ہمارے جائزے کا جزو نہیں ہے لیکن تاریخی تناظر کی خاطر اس کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے -

اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کرکے دیسی زبان کو رائج کرنے کا فیصلہ ۲۰ نومبر ۱۸۳۷ء کو کیا تھا لیکن اردو زبان میں قانونی موضوعات پر تراجم اس سے بہت پہلے شروع ہوگئے تھے - ۱۸۰۰ء کے قانون کا ترجمہ گل کرسٹ نے کیا تھا ، ۱۸۰۳ء میں ہدایت نامہ مالگزاری اور ۱۸۲۰ء میں قانون دیوانی کا ترجمہ ''خلاصہ فہرست نما'' ڈبلیو ایچ ٹرانٹ اور نعمت علی کی شراکت میں شائع ہوا - ''دستور العمل عدالت دیوانی'' کے مؤلفین ولیم میکفرسن اور جارج اسمواٹ کی امداد منشی نصیر الدین احمد نے کی - قانون سے متعلق فرہنگوں کی فہرست درج ذیل ہے -[۲]

1. Glossary of Legal Terms by Charles Wilkins, published in 1813 (URDU to English)
2. Glossary of Indian Terms for the use of the various Dept. of the Govt. of East India Co., published by the Govt. of East India Co. contains 1223 pages.
3. Kachehri technicalities or a Glossary of legal terms, by Patrick Carnegy, Commissioner of Rai Bareli : 1877 (Allahabad).
4. Carnegy's vocabulary of Law Terms by Patrick Carnegy ; published 1865.
5. Elliot's supplemental glossary by H. M. Elliot.
6. Guide to legal translation (URDU to English) by Durga Prashad, Benares : 1869 (helped and assisted by Sir Syed Ahmad Khan, then subordinate and Small Causes Court Judge of Benares.)
7. A Hindustani English Law & Commercial Dictionary by S. W. Fallon; Ph. D. Benares, 1879.

8. An English Hindustani Law & Commercial Dictionary by S. W. Fallon. Calcutta, 1858.
9. Concise Law Dictionary by Durga Parshad, English to Urdu ; Urdu to English. and legal maxims & phrases, 1905.
10. Translator's Friend or a Dictionary of law terms by Kshetra Mohan Banerjee, Revised by Purna Chandra Dutta, Calcutta 1898 (English, Urdu and Bengali.)

۱۱ - اصطلاحات قانونی مرتبہ احمد حسین خان - اردو سے انگریزی - لاہور ۱۸۹۸ء -

۱۲ - اعظم اللغات (اردو قانونی لغت) مرتبہ محمد خان برتر -

۱۳ - لغات قانونی مرتبہ محمد شمس الدین خان ۱۳۲۷ف -

۱۴ - اردو قانونی ڈکشنری - مرتبہ جلیل الرحمان خان - ساڈھور - ضلع انبالہ ۱۸۹۲ء -

اس جگہ بات مکمل کرنے کی غرض سے اگر دہلی کالج کے قانونی تراجم کا ذکر بھی کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا - دہلی کالج نے ۵ برس (۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۵ء) کے قلیل عرصہ میں مندرجہ ذیل تراجم و تالیفات موضوعات پر شائع کیے [۳۰]

۱ - جورس پروڈنس کا ترجمہ اصول قانون -

۲ - اصول حکومت -

۳ - اصول قوانین مالگذاری -

۴ - اصول قوانین ممالک مختلفہ (مؤلفہ پروفیسر ہٹروس مترجمہ پنڈت رام کشن) -

۵ - سراجیہ (اسلامی قانون وراثت پر) -

۶ - قانون عہدی و فوجداری (ترجمہ کتاب میکناٹن) -

۷ - قانون مال -

۸ - دھرم شاستر اور شرع اسلام -

۹ - اسکب وتھ کا خلاصہ قانون فوج داری -

۱۰ - پرنسپ کا خلاصہ دیوانی -

۱۱ - مارشن کا سیول گائیڈ بمعہ خلاصہ شرع اسلامی اور دھرم شاستر -

۱۲ ضابطہ مالگذاری -

۱۳ - اسسٹنٹ مجسٹریٹ گائیڈ -

۱۴ - مختصر شرح قدوری -

۱۵ - ہدایہ (جزو) -

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے شہرہ آفاق ترجمے ''تعزیرات ہند'' سے ۱۷ برس پہلے ایک انگریز کمشنر ایلیٹ نے ۱۸۴۷ء میں تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا تھا ؟

آئیے اب سائنسی اور فنی تراجم کی بات کی جائے - اردو میں ترجمہ ہونے والی سائنس کی پہلی کتاب ''ٹریٹائز آن مزل ڈیپازٹس'' ہے - مصنف مترجم اور مقام ندارد ہے - ۹ × ۵ ½ کی تقطیع پر ۱۳۲ صفحے کی کتاب ہے تاریخ طباعت ۱۵ جولائی ۱۸۲۶ء درج ہے -

نواب شمس الامرا دکن کی علم دوست شخصیت تھے - ان کا پورا نام نواب محمد فخر الدین بہادر تھا - انھیں علمی کتابوں کو انگریزی سے اردو میں منتقل کرنے کا خیال آیا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ریورنڈ چارلس نامی انگریز مصنف کے چند رسالوں کو منتخب کیا جو ۱۸۱۸ء میں شائع ہوئے تھے - ترجمہ کا کام میر امان اللہ دہلوی ، غلام محی الدین حیدرآبادی ، مسٹر جونس اور موسیوتندپی کے سپرد ہوا - ۱۸۳۹-۴۰ء کے دوران چھ رسالے علم جرثقیل ، علم آب و ہوا ، علم مناظر اور علم برق و مقناطیس پر شائع ہوئے - ترجمہ مطابق اصل تھا اور پیرایہ سوال و جواب کا تھا ، نقشے بھی دیے گئے تھے ، زبان صاف اور سلیس تھی اور اصطلاحات کے لیے عربی اور فارسی کے مروجہ الفاظ استعمال ہوئے تھے ، البتہ جہاں ان زبانوں میں متبادل لفظ نہیں ملا تھا وہاں انگریزی اصطلاح

rekhta

برقرار رکھی گئی تھی ۔ نواب شمس الامرا کے اتباع میں دوسروں نے بھی ترجمے کا سلسلہ شروع کیا ۔ چنانچہ ہیئت کی مشہور کتاب "چغمینی" کی اردو شرح "شرح چغمینی" کے نام سے شائع ہوئی ۔ نواب عمدۃ الملک محمد رفیع الدین خاں بہادر کی فارسی تصنیف "رفیع البصر" کا اردو خلاصہ رتن لال نے "منتخب البصر" کے نام سے ۱۸۲۱ء میں شائع کیا ۔ یہ کتاب بھی سوال و جواب کے پیرائے میں ہے اور اس میں متعدد نقشے بھی شامل ہیں ۔

دکن میں کام کی داغ بیل تو پڑ چکی تھی ، مگر اردو اصطلاحات وضع کیے بغیر کام آگے نہیں بڑھ سکتا تھا ۔ یہ اہم ترین کام دہلی کالج میں شروع ہو چکا تھا ۔ اس کالج کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ یہاں جدید علوم کی تدریس خاصتاً اردو زبان میں نہایت کامیابی سے ہوتی تھی جس کی شہادت تاریخی دستاویزات میں موجود ہے ۔ دہلی کالج میں ایک ورنیکولر لینگویج سوسائٹی قائم کی گئی جس کا اصل نام "دی سوسائٹی فار پروموشن آف نالج انڈیا تھرو دی میڈیم آف لینگویجز" تھا[۶]۔ اس سوسائٹی نے مترجمین کے لیے جو قواعد و ضوابط اور وضع اصطلاحات کے جو اصول مرتب کیے تھے وہ آج بھی سو فی صد قابل عمل ہیں مثلاً مترجمین سے کہا گیا تھا کہ ترجمہ لفظ بہ لفظ نہ کیا جائے بلکہ ان کا اصل مقصد صحیح مفہوم کی ادائیگی ہونا چاہیے خواہ ترجمے میں جملے کی ساخت کیسی ہی کیوں نہ بدل جائے[۵]۔ دہلی کالج کے شائع کردہ تراجم نے تقریباً ڈیڑھ سو درسی کتابوں کا اردو ترجمہ شائع کیا ۔ ان میں سے ۲۷ کتابوں کی فہرست آخر میں بطور ضمیمہ دی گئی ہے ۔ ان کتابوں کی زبان اس دور کے مزاج کے مطابق سلیس اور سادہ ہے ۔

اسی دور میں ایک مفید سلسلہ لکھنؤ سے بھی شائع ہوا تھا ۔ لکھنؤ میں ایک رصدگاہ نوابی دور میں ہی قائم ہو گئی تھی ۔ اس کے سربراہ کرنل و لبکاک کی نگرانی میں ایک کارکن مولوی کمال الدین نے علم الہوا نوریات ، بصریات ، طبیعیات ، آلات ریاضی ، مقناطیس اور کیمیا وغیرہ پر بارہ رسائل کا اردو ترجمہ کیا ۔ یہ رسائل نا پید ہیں[۸]۔

اردو میں علمی تصنیف و تالیف و ترجمہ کے کام کو جو مہمیز سرسید نے لگائی اسی کی بدولت اردو زبان ترقی یافتہ زبانوں کے برابر

آ گئی سائنٹیفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد میں یہ تھا کہ ہندوستان میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر ہونی چاہیے جو عمدہ کتابیں اردو میں ترجمہ کرکے چھاپے ، ہر چند کہ یہ سوسائٹی سائنس کے لیے مخصوص نہ تھی لیکن سرسید کا میلان سائنس کی طرف ہمیشہ سے تھا اور خود اس انجمن کا نام بھی اسی رجحان کا غماز ہے ۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام ۱۸۶۳ء میں عمل میں آیا تھا اور ۱۸۷۷ء تک اس انجمن نے جو تراجم شائع کیے ان کی ایک فہرست ، جو غالباً نامکمل ہے درج ذیل ہے[۹]۔

1. Rollen's "Ancient History of Egypt".
2. Persian Translation of "Exoos's History of China"
3. Rollen's "Ancient History of Greece".
4. Scott Burn's "Modern Farming".
5. William Senior's "Political Economy".
6. Elphinston's "History of India".
7. Harris's "Electricity".
8. Wilkinson's "Geography" compiled from various English works.
9. Selection from Mill's "Political Economy".
10. Sir John Malcolm's "History of Persia".
11. Todhunter's "Mansuration".
12. Todhunter's "Trigonometry".
13. Todhunter's "Algebra" for beginners.
14. Todhunter's "Theory of Equation".
15. Galbraith and Haughton's "Scientific Manual Euclid".
16. Galbraith and Haughton's "Scientific Algebra".
17. Todhuneter's "Euclid".
18. Bernard Smith's "Arithmetic" for schools.
19. Bernard Smith's "Algebra" for schools.

20. Galbraith's. "Arithmetic"
21. Todhunter's "Algebra" for colleges and schools.
22. Todhunter's "Plain Coordinate Geometry".
23. Todhunter's "Integral Calculus"
24. Todhunter's "Differential Calculus".

(مرتبہ مسٹر کریم)

یہاں پر سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی کی جانشین سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ یہ انجمن کراچی یونیورسٹی میں قائم ہے اور اس کی شاخیں تمام ملکی یونیورسٹیوں میں ہیں۔ یہاں سے کئی سائنسی تراجم شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ انجمن سالانہ سائنس کانفرنس بھی منعقد کرتی ہے جس کی تمام کارروائی اردو میں ہوتی ہے۔ کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے مقالات اور ان کے خلاصے اردو کے سائنسی ادب میں گراں بہا اضافہ ہیں۔

سائنٹیفک سوسائٹی محض ایک ادارہ نہیں، ایک تحریک بھی تھی جس کے زیر اثر ہندوستان کے مختلف شہروں میں اسی نام کی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان میں سب سے قابل ذکر مظفر پور، صوبہ بہار کی سائنٹیفک سوسائٹی ہے جو ۲۲ مئی ۱۸۶۸ء کو قائم ہوئی۔ یہاں سے سیاسیات، فلکیات، جغرافیہ، جبر و مقابلہ، طبیعیات، معدنیات، علم مثلث اور فن تعمیر پر کتابیں شائع ہوئیں۔ ترجمہ کا کام کرنے والوں میں سرفہرست رائے سوہن لال، سپرنٹنڈنٹ، نارمل اسکول، پٹنہ کا نام آتا ہے۔

رڑکی انجینئرنگ کالج نے اردو زبان میں کئی فنیاتی کتب شائع کیں جن میں سے بعض میری نظر سے گزری ہیں ان میں اصطلاحات اردو کی ہی استعمال کی گئی ہیں—چونکہ ابھی پاکستان میں یہ کتب ناپید ہیں اس لیے ان کے بارے میں میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

آج سے تقریباً سو برس پہلے حکومت بنگال نے دیسی زبان میں طب کی کتابوں کے ترجمے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ارکان بابو راجندر لال میتر، مولوی تمیز الدین خان بہادر، سوہن لال اور بعد

میں سید حسین بلگرامی تھے۔ انہوں نے پہلے اصول وضع اصطلاحات متعین کیے۔ یہ کمیٹی عملی کام تو نہ کرسکی لیکن نظری اعتبار سے وضع اصطلاحات کے اصول اور ترجمہ کا ایک واضح طریق کار متعین ہو گیا۔

اس کے بعد اردو تراجم کا کام شمالی ہند میں نہ ہو سکا البتہ دکن کی آزاد ریاست حیدر آباد نے اس کام کا بہت بڑے پیمانے پر بیڑا اٹھایا۔ دکن میں سر اکبر حیدری، راس مسعود، مولوی عبدالحق اور ان کے ہم خیال حضرات کی مساعی سے جامعہ عثمانیہ ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی جو دراصل سرسید کے اردو یونیورسٹی کے خواب کی تعبیر تھی۔ اردو کی تدریس کے لیے کتابی مواد مہیا کرنے کی غرض ۱۹۱۶ء میں جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ قائم ہوا جہاں وضع اصطلاح کے ساتھ ساتھ کتابوں کے تراجم کا کام بھی شروع ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اصطلاح سازی کے فن سے متعلق اردو میں جتنے باوقار اور مستند اہل فن، ماہرین اور علما نے حصہ لیا، اس کی مثال کسی دوسری زبان مین نہیں ملتی۔ ان میں سرفہرست مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا نام آتا ہے جن کی کتاب "وضع اصطلاحات" اس فن کی منفرد کتاب ہے ان ہی ماہرین نے وہ تراجم کیے جو آج بھی مستند کہے جا سکتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کے کام پر اپنے الفاظ میں کچھ کہنے کے بجائے بہتر یہی سمجھتا ہوں کہ آفتاب حسن کی تصنیف "اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات" سے ایک اقتباس درج کردوں:

سنہ ۱۹۲۶ء میں دارالترجمہ کا قیام ہوا اور وضع اصطلاحات کے لیے ایک مجلس بنائی گئی جس میں چوٹی کے اہل فن شریک کیے گئے اور یہ کام شروع کر دیا گیا۔

جن اصولوں پر اصطلاحات وضع کی گئیں ان کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ وضع اصطلاحات کے لیے ماہرین زبان اور ماہرین فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے تاکہ جو اصطلاح بنے وہ زبان کے سانچے میں ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے ناموزوں نہ ہو۔

۱۲۲۱۹

۲ - اس کام کے لیے عربی ، فارسی ہندی میں سے کسی زبان کا بھی ایسا مادہ لے سکتے ہیں جو سہل ہو یعنی جو مروج اور موزوں ہو - الفاظ دوسری زبان کے لے سکتے ہیں - لیکن ان سے اشتقاق کے ذریعے جو الفاظ بنائے جائیں وہ اردو صرف و نحو کے بموجب ہوں گے یعنی لفظ دوسری زبان سے لیا جائے گا لیکن اس کے نحوی قاعدے نہیں لے سکتے -

۳ - حتی الامکان ایسے مختصر الفاظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کرسکیں -

۴ - ترکیب میں انھی اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے جو ابھی تک ہماری زبانوں میں مستعمل ہیں -

۵ - اسما سے مصادر بنائے جائیں -

۶ - قدیم کارآمد اصطلاحیں برقرار رکھی جائیں لیکن جو صحیح نہیں ہیں لیکن رائج ہیں ، یا صحیح ہیں لیکن مشتقات کے لیے مناسب نہیں ہیں انھیں بدل دیا جائے -

۷ - ایسے انگریزی لفظ جو عام طور پر رائج ہیں یا ایسی اصطلاحیں جو موجدوں یا تحقیق کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہیں انھیں بدستور رہنے دیا جائے -

۸ - بعض انگریزی اصطلاحیں جو اب جدید تحقیقات کے لحاظ سے غلط معنی دیتی ہیں انھیں بالکل بدل دیا جائے -

اسی اصول پر کام چلتا رہا - کیمیا میں یہ کیا گیا کہ بین الاقوامی اصطلاحوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا - انگریزی ہی میں رہنے دیا گیا اور کیمیائی علامتوں کے لیے بھی لاطینی حروف کو باقی رکھا اس لیے کہ دنیا کی ہر زبان کا اس پر اتفاق ہے -

حیاتیات میں پودوں اور حیوانوں کے خاندانی ناموں کو چھیڑا نہ گیا -

دارالترجمہ نے جب انٹرمیڈیٹ کی کتابیں تیار کر دیں تو ۱۹۱۸ء میں جامعۂ عثمانیہ کا قیام ہوا - یہ یونیورسٹی تیس سال کے

عرصے میں اس قابل ہوگئی کہ اس میں اعلی سے اعلی تعلیم اردو میں دی جانے لگی -

اس تیس سال کے عرصے میں دارالترجمہ نے چار سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں ، جن میں سے تقریباً پونے تین سو کتابیں سائنس کی ہیں - ان تراجم میں تقریباً ہر شعبہ کی مستند کتابیں موجود ہیں - ان میں اکثر وہ درسی کتابیں ہیں جو عام طور پر اس زمانے میں ہندوستان کے کالجوں میں پڑھائی جاتی تھیں - ان میں اکثر جدید ایڈیشنوں کی شکل میں آج بھی شریک نصاب ہیں - یہ کتابیں دراصل اس نقطۂ نگاہ سے چنی گئی تھیں کہ جامعۂ عثمانیہ کی مخالفت دوسری جامعات میں کم ہو اور اس کے اسناد کو تسلیم کرلینے میں کوئی دقت نہ ہو - ان ترجموں کے لیے بے شمار اصطلاحیں وضع کی گئیں جو ہمارے پاس اس وقت موجود ہیں اور اردو زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں -

بدقسمتی یہ ہے کہ اس ملک میں جامعۂ عثمانیہ کی عظمت اور اہمیت کا صحیح احساس دلوں میں موجود نہیں ہے - یہاں اس کے ۳۰ سالہ کام کو نظر انداز کرنے یا اس کو بے حیثیت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے - کم لوگ ہیں جو اس یونیورسٹی کے ماہرانہ اور رہبرانہ اقدام کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھ سکیں - ایسے دور میں جب انگریزی راج کا طوطی بول رہا تھا اور انگریزی زبان کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا تھا ، پیٹ بھرنے اور روٹی کمانے کا ذریعہ بس صرف انگریزی رہ گئی تھی ، یہ کہنا کہ تعلیم اردو زبان میں ہو اور اعلی تر مضامین اس زبان میں پڑھائے جائیں تا کہ انگریزی کی دست نگری باقی نہ رہے ، بہت دلیری اور بڑی ہمت چاہتا تھا - جامعۂ عثمانیہ نے حصول علم کی نئی راہیں کھولیں اور یہ بانگ دہل اعلان کر دیا کہ فنون ہوں یا علوم ، اردو میں ہر مضمون کو ادا کرنے اور اس کو اپنانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے - جامعۂ عثمانیہ کے فارغ طلبہ نے یورپ اور امریکہ کی جامعات سے اعلی ڈگریاں لے کر یہ بھی ثابت کر دیا کہ اردو کے ذریعے تعلیم کسی بھی ذریعۂ تعلیم سے کم نہیں بلکہ اعلی اور افضل ہے -

افسوس ہے کہ ہندوستان والوں کو یہ یونیورسٹی ایک آنکھ نہ بھائی - اس کے نام اور اس کے کام کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی گئی لیکن

یہ کام ختم ہونے والا نہیں ہے ۔ جامعۂ عثمانیہ کی ساری کتابیں پاکستان میں موجود ہیں ۔ اس کی وضع شدہ اصطلاحات کا پورا ذخیرہ بھی استفادہ کے لیے حاضر ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ علوم سائنسی کو اردو میں بلا تکلف ادا کرنے والے بھی اس وقت کافی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں ۔

کراچی یونیورسٹی کا شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ ادارہ صحیح معنوں میں مذکورہ الصدر اداروں کا جانشین اور پاکستان میں علمی اردو کے نفاذ کا ہراول ہے ۔ یہ ادارہ ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا تھا ۔ آج تک یہاں سے بیس تراجم شائع ہوچکے ہیں جن میں سے ایک عربی سے ترجمہ اور باقی انگریزی سے ہیں ۔ یہ تمام تراجم ملک بھر میں درسی اور حوالجاتی مقاصد پورے کر رہے ہیں اور عام پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے استفادہ کررہے ہیں ۔ وضع اصطلاح کے میدان میں بھی اس شعبہ کو دوسرے تمام اداروں پر سبقت حاصل ہے اس شعبہ نے آج تک بارہ فرہنگیں شائع کی ہیں اور تین فرہنگیں زیر ترتیب ہیں ۔

ان مطبوعات کی فہرست درج ذیل ہے ۔

۱ ۔ جدوجہد پاکستان از اشتیاق حسین قریشی ۔
۲ ۔ تاریخ فلسفہ از کلیمنٹ ویب ۔
۳ ۔ سلطنت دہلی کا نظام حکومت از اشتیاق حسین قریشی ۔
۴ ۔ اینگلو امریکا کا خطی جغرافیہ از وہائٹ ، فوسکیو اور سیکنائٹ ۔
۵ ۔ تشریح نباتات از کیتھرین الینو ۔
۶ ۔ جبتلوں کی تشریح (دو جلدوں میں) از والکرٹ ۔
۷ ۔ طبیعی کیمیا (دو جلدوں میں) از گلاسٹون ۔
۸ ۔ قدر اور سرمایہ از ہکس ۔
۹ ۔ معاشی نمو کے مراحل از روسٹو ۔
۱۰ ۔ نافع معنی مطروحات از بیٹ مین ۔
۱۱ ۔ نفسیات کی بنیادیں از بورنگ، لانگ فیلڈ اور ولڈ ۔
۱۲ ۔ پاکستان کا سمندری جھینگا ۔

۱۳ ۔ قائداعظم محمد علی جناح کی نجی زندگی کے دو اہم پہلو از شریف الدین پیرزادہ ۔
۱۴ ۔ بادشاہ از نکولو میکیا ویلی ۔
۱۵ ۔ معاہدہ عمرانی از ژاں ژاک روسو ۔
۱۶ ۔ تعارف اخلاقیات از ولیم للی ۔
۱۷ ۔ بین الاقوامی تعلقات دو عالمی جنگوں کے درمیان از ای ایچ کار ۔
۱۸ ۔ سلوک المالک فی تدبیر الممالک از ابن ابی ربیع ۔
۱۹ ۔ برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ از اشتیاق حسین قریشی ۔
۲۰ ۔ تاریخ جامعہ کراچی از نصیب اختر ۔

شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے اب تک طبیعیات و ریاضی ، حیاتیات ، شماریات عمرانیات فلسفہ ، کیمیا ، معاشیات ، تجارت و بینکاری، قانون ، علم کتب خانہ یا علم کتابداری، برقیات اور اسماء العلوم پر فرہنگیں شائع کی ہیں ۔ ان کے علاوہ شعبہ کے مجلہ جریدہ میں نفسیات ، حیاتی کیمیا ، جغرافیہ ، ارضیات طب قانون وغیرہ کی اصطلاحات شائع ہو چکی ہیں جریدہ میں اشاعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ اصطلاحات اہل علم و دانش کی نظر سے گزریں اور ان کی قیمتی آرا موصول ہونے کے بعد ان کو حتمی شکل دے کر کتابی فرہنگ کی صورت میں شائع کیا جاسکے ۔ جریدہ کے اب تک ۱۸ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں ۔

شعبہ کے تراجم کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حتی الوسع انگریزی اصطلاحتوں کے اردو مترادفات استعمال ہوئے ہیں اور سعی یہ کی گئی ہے کہ ایک اصطلاح کے لیے اردو متبادل بھی ایک ہی ہوں اور ایسے مترادفات کے لیے جن کے معنی کا تھوڑا سا لیکن بامعنی فرق ہو ، اردو کے بھی الگ الگ مترادفات استعمال کیے جائیں ۔ شعبہ کی وضع کردہ اصطلاحات پر بعض اصحاب دانش نے مشکل ، معرب اور مفرس ہونے کا الزام لگایا ہے ۔ اس سلسلے میں مؤدبانہ عرض ہے کہ :

(۱) اصطلاح جس مضمون کی ہوتی ہے اس مضمون کے برتنے والے کے لیے آسان ہوتی ہے ، ہر خاص و عام کے لیے نہیں ۔ انگریزی کی

بظاہر آسان تلفظ والی اصطلاحات کے عام معنی سے تو ہر انگریزی پڑھا لکھا آدمی واقف ہو سکتا ہے لیکن اصطلاحی اور علمی معانی و مفہوم صرف مضمون برتنے والے کے لیے سہل ہوتے ہیں ، چنانچہ تلفظ کی آسانی کو معیار بنانا غلط ہے ۔

(۲) اردو ، عربی اور فارسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے ، اس ورثے سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے ۔ علاقائی زبان سے استفادہ اس لیے محدود ہوتا ہے کہ ان کے ورثے میں بھی عربی فارسی شامل ہیں ۔

ایک شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ وفاق اردو کالج میں بھی قائم ہے لیکن یہاں سے میری اطلاع کے مطابق ترجمے شائع نہیں ہوئے ہیں ۔

اردو تراجم کے ضمن میں مرکزی اردو بورڈ کا جو آج کل اردو سائنس بورڈ کے نام سے جانا جاتا ہے ، نام بھی آتا ہے مگر یہاں سے شائع ہونے والے بیشتر تراجم سائنس اور فنیات سے متعلق نہیں تھے ۔ تاہم بورڈ نے جو کام کیا ہے وہ لائق تحسین ہے ۔ اس سے اردو پڑھنے والوں کو عمدہ کتابیں پڑھنے کو ملیں البتہ انگریزی اصطلاحات کو جس طرح من و عن اردو رسم الخط میں لکھا گیا ہے اس سے اردو پر خاصی ضرب پڑتی ہے ۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور اور فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی میں بھی اصطلاحات سازی کا کام ہوا ہے ۔ فیصل آباد سے شائع ہونے والی زرعی اصطلاحات کی فرہنگ بڑی وقعت کی حامل ہے ۔

انجمن ترقی اردو نے اردو اصطلاحات کے میدان میں جو کام کیا ہے وہ واقعی بے نظیر ہے ۔ اس انجمن نے نہ صرف اصطلاحات کی فرہنگیں شائع کیں بلکہ انگریزی لغت بھی شائع کی جو کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔

مقتدرہ قومی زبان ، جس کے ہم آج مہمان ہیں ، سرکاری ادارہ ہونے کے باوجود نہایت عظیم کام کر رہا ہے ۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ وطن عزیز میں اردو کو ہر لحاظ سے اور ہر سطح پر ہر مقصد کے لیے رائج اور نافذ کیا جائے ۔ مقتدرہ کے طریق کار سے متعلق یہاں کچھ کہنا فضول ہے البتہ ایک پہلو ایسا ہے جس کا ذکر نہ کرنا میرے نزدیک شدید ناسپاسی ہوگی ۔

مقتدرہ قومی زبان نے اردو کے لیے کام کرنے والے مختلف اداروں کے ساتھ اشتراک کا جو لائحہ عمل بنایا ہے وہ لائق صد تحسین ہے ۔ اس سے دو فائدے ہوئے ہیں ۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ دوسرے ادارے جن کو ارباب حل و عقد کی عدم توجہی کی شکایت تھی اب قومی زبان کی ترویج و نفاذ کی تحریک میں برابر کے شریک ہو گئے ہیں ، گویا ملک بھر کے اردو نوازوں کا ایک کنسورشیم بن گیا ہے ۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اشتراک عمل میں چونکہ مالی اشتراک شامل ہے لہٰذا بہت سے ادارے اور افراد جو مالی وسائل کی کمیابی یا نایابی کی وجہ سے اپنے پروگراموں کو چلا نہیں سکتے تھے اب کئی گنا فعال ہو گئے ہیں ۔ ان میں ہی میرا ادارہ بھی شامل ہے ۔

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، کراچی یونیورسٹی من حیث الادارہ مقتدرہ قومی زبان کا اور میں ذاتی حیثیت سے صدر نشین مقتدرہ جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا سپاس گزار ہوں ۔ اگر مقتدرہ کا تعاون ہمیں حاصل نہ ہوتا تو یقین کیجیے ، ہم بہت کچھ نہیں کر سکتے تھے ۔

نجی تجارتی اداروں نے بھی اردو میں بہت سی عام پسند سائنسی کتابوں کے تراجم شائع کیے ہیں ، لیکن ان کتابوں میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اصطلاحات کے حسب منشا اردو مترادفات ، جن میں سے بیشتر غلط ہیں ، استعمال کیے گئے ہیں ایک ہی کتاب میں ایک ہی اصطلاح کے لیے کئی کئی اردو مترادفات استعمال ہوئے ہیں جس سے بڑی الجھن پیدا ہوتی ہے ۔ بعض ناشروں نے ترجمہ تو کرایا کسی ماہر مضمون سے لیکن اس کی ادارت یا تدوین یا نظرثانی اپنی پسند کے کسی ادیب یا صحافی سے کرائی جس سے مجموعی طور پر متن میں بڑا فرق پڑ گیا ۔ یہ پالیسی ملک کے بیشتر ناشرین نے اپنائی تھی ۔ اس کی صرف مذمت ہی کی جاسکتی ہے کیونکہ سائنسی زبان ادبی اور شاعرانہ زبان سے یکسر مختلف ہوتی ہے ۔ میرے اپنے دو تراجم اس ستم ظریفی کا شکار ہو چکے ہیں ۔ ان کتابوں میں کوئی اہم اور حوالے کی مستند کتاب شامل نہیں ہے ۔

اس مختصر مگر تشنہ جائزے کے اختتام پر میں چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ اردو میں علمی کام کم نہیں ہوا ، معقول حد تک ہوا ہے ، البتہ وقفوں سے ہوا ہے ۔ ضرورت اس اس کی ہے کہ کام مسلسل ہو

اور اس میں زیادہ سے زیادہ اہل علم و دانش کو شریک کیا جائے۔ اس معاملہ میں یوگوسلاویا ،ایران اور ہندوستان کے تجربے سے سبق لیا جاسکتا ہے۔اگر ہمیں اپنے ملک میں ''سائنسی معاشرہ'' پیدا کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ محض درسی اور حوالجاتی کتب پر ہی توجہ نہ کی جائے بلکہ بچوں کے ادب سے لیکر اعلیٰ ترین معیار اور سطح کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔ گویا کام صرف عمودی رخ پر نہیں بلکہ افقی رخ پر بھی ہو۔ اس کار خیر میں نجی اشاعتی ادارے بھی شریک کیے جائیں تو کام دو چند ہو سکتا ہے۔ آخری معروضہ یہ ہے کہ اصطلاحات کی نوعیت کے بارے میں جو اختلافات ہیں ان کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ فن وضع اصطلاحات پر بہت کام ہو چکا ہے، وہ کام اتنا جامع اور مکمل ہے کہ اس سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے اسی کو رہنما بنا کر آئندہ ترجمہ کے کام کو صحیح خطوط پر استوار کیا جاسکتا ہے۔

حوالے

۱۔ قدسی ، عبیداللہ : اردو میں عربی اور فارسی کے ترجمے ، جریدہ ۵ کراچی ، کراچی یونیورسٹی شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ سال اشاعت ندارد۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ حیدر ، پروفیسر شیخ (ایڈووکیٹ) اردو زبان میں قانونی تعلیم کے امکانات کا جائزہ ، جریدہ ۴ کراچی ، کراچی یونیورسٹی شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، سال اشاعت ندارد۔

۴۔ شکیب ، بدر : اردو کی سرکاری حیثیت اور ایسٹ انڈیا کمپنی ، کائنات جشن سمیں نمبر ،کراچی ، وفاق اردو سائنس کالج ۱۹۸۱ء ، ص۲۰۵ تا ۲۱۰۔

۵۔ شاہد ، خواجہ حمید الدین : اردو میں سائنسی ادب کا اجمالی جائزہ ، کائنات جشن سمیں نمبر ،کراچی ، اردو کالج ۱۹۸۱ء ، ص ۳۲۰ تا ۳۲۳۔

۶۔ کوثر ، ڈاکٹر اے ایچ : اردو میں علمی و سائنسی ادب کے فروغ میں دہلی کالج کا حصہ ، کائنات جشن سمیں نمبر ، کراچی وفاق اردو سائنس کالج ، ۱۹۸۱ء ، ص ۳۲۴ تا ۳۳۳۔

۷۔ حسن ، آفتاب : اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات ، کراچی ، کراچی یونیورسٹی شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، ۱۹۶۵ء ، ص ۲۹۔

۸۔ حسن ، آفتاب : ایضاً ، ص ۱۰۔

۹۔ جونا گڑھی ، قاضی احمد میاں اختر (مرحوم) : سر سید کا علمی کارنامہ ، کراچی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، ۱۹۶۴ء ، ص ۴۳ - ۴۵۔

ضمیمہ — مطبوعات دہلی کالج

نمبر شمار	تصنیف	مصنف، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
۱	اردو لغت	دہلی کالج	دہلی	یہ کتاب لکھی گئی لیکن چھپ نہ سکی۔	
۲	اصول پروفیشنل پولیٹکل اکانومی (الف)	مترجم وزیر علی	"	۱۸۴۴ء	۱۸۴
۳	اصول جبر و مقابلہ (الف)	ماسٹر رام چند	"	۱۸۳۵ء	۳۷۸
۴	اصول پلوست	سرجن نارٹن	"	۱۸۳۵ء	۱۵۵
۵	اصول علم انتظام بدن (الف)	مترجم دھرم نارائن مصنف فرانس دے لینڈ	"	۱۸۳۶ء	۳۳۰

نمبر شمار	تصنیف	مصنف، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
۶	اصول علم حساب و جزئیات (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف جے ایل بیجریٹس	"	۱۸۳۵ء	۶۱۴
۷	اصول کلکٹری اور اصول قوانین گورنمنٹ (الف)	مترجم پنڈت رام کرشن	"		
۸	اصول علم حیات (الف)	مترجم پنڈت ایو دھیاپرشاد اور رام چندر	"	۱۸۴۸ء	۳۲۵
۹	اصول علم طبعی (الف)	مترجم ایودھیا پرشاد اور شیا پرشاد		۱۸۵ء	۱۶۹
۱۰	اصول قانون (الف)	مترجم رام کرشن	"	۱۸۴۵ء	۳۳۰
۱۱	اصول قوانین ممالک (الف)	مترجم رام کرشن مصنف ایف بٹردس	"	۱۸۴۴ء	۳۶۰

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
١٢	اصول علم ہیت (الف) نجوم و ہیئت	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف پرشل دیوی کیسل	دہلی	١٨٣٨ء	
١٣	اصول علم ہندسہ پریکٹیکل جیومیٹری (الف)	مصنف ماسٹر رام چندر	،،	١٨٣٣ء	
١٣	اصول قواعد و اخلاق (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف ایف پتروس	،،	١٨٣٥ء	٣٦٠

نوٹ :
الف سے مراد انگریزی سے ترجمہ کی گئیں جبکہ ع سے مراد عربی میں ، ف سے مراد فارسی میں ترجمہ کی گئیں ۔

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
١٥	اصول سرکاری محاصل (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف ایف پتروس	دہلی	١٨٣٥ء	
١٦	اصول علم مثلث (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف مستن ، بجرایٹ اور سمن	،، ،،	١٨٣٣ء	٢١٧

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
١٧	اصول قوائد مایعات (الف)	مترجم اتودسیا پرشاد مصنف تھاسس ویجڑ	دہلی	١٨٥٠ء	
١٨	اصول قوانین و دیوانی و فوجداری (الف)	پنڈت رام کرشن	،،		
١٩	اصول قوانین ہندی	ترجمہ علماے دہلی کالج	،،	١٨٤٣ء	٣١
٢٠	اصول منطق (الف)	ترجمہ مولوی سید محمد	،،	١٨٤٤ء	٥٣
٢١	جیاگرافکل ہسٹری آف محمڈن جیورس پروڈس (الف)	سبحان بخش	،،	١٨٤٨ء	
٢٢	پیمائش خطوط (الف)	مترجم دہاری لال مصنف ایلٹ	،،	١٨٥٠ء	١١٥

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
٢٣	تاریخ ابن فلسکان	سبحان بخش	دہلی		
٢٤	تاریخ ابو الف درا تین جلدوں میں (الف)	مترجم کریم الدین	,,	١٨٣٤ء	٢٦٠
٢٥	تاریخ انگلستان (الف)	حسن علی خان و پنڈت دھرم نرائن	,,		
٢٦	تاریخ ایران (الف)	منشی حسین	,,	١٨٣٥ء	٢٥٠
٢٧	تاریخ بری و بحری (الف)	مترجم شیوا پرشاد	,,	١٨٣٥ء	
٢٨	تاریخ بنگل (الف)	مترجم نور محمد مصنف مدش مین	,,	١٨٣٩ء	٢٩٠
٢٩	تاریخ پنجاب (الف)	مترجم سنکرا داس	,,	١٨٣٦ء	٢٥٦

نمبر شمار	تصنیف	مصنف : متراجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
٣٠	تاریخ روم (الف)	مترجم شیوا پرشاد ڈاکٹر گولڈ اسمتھ	دہلی	١٨٣٥ء	٣٢٠
٣١	تاریخ شعرائے اردو	مولوی کریم الدین و ایف فیلن	,,	١٨٣٨ء	٥٠٣
٣٢	تاریخ شعرائے عرب	مولوی کریم الدین	,,	١٨٣٤ء	٣٣٠
٣٣	تاریخ کشمیر (الف)	مترجم اشرف علی مصنف محمد اعظم	,,	١٨٣٦ء	٣٥٨
٣٤	تاریخ مغلیہ	مترجم نور محمد اور منشی حسین	,,	١٨٣٤ء	١٢٠
٣٥	تاریخ ہند (الف)	جارج کلارک مارش مین	,,	١٨٣٣ء	٢٨٣
٣٦	تاریخ یونان (الف)	مترجم وزیر علی اور شیوا پرشاد ، مصنف ڈاکٹر گولڈ اسمتھ	,,	١٨٣٦ء	٣٠٣

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
۲۷	تحریر اقلیدس مقالہ (ف) ایک تا چھ ، گیارہ ، بارہ	مولوی ملوک علی مترجم	دہلی	۱۸۴۳ء	۳۹۸
۲۸	تذکرۂ حکما	سبحان بخش	"		
۲۹	تذکرۂ سرو (الف)	مترجم موتی لال	"	۱۸۴۷ء	۱۱۲
۳۰	تذکرۂ سکندر اعظم (الف)	مترجم شیدو نارائن	"	۱۸۴۷ء	۱۵۳
۳۱	تذکرۂ مفسرین	سبحان بخش	"	۱۸۴۸ء	
۳۲	تشریح الاجسام	ڈاکٹر میر فضل علی	"	۱۸۴۷ء	۱۸۳
۳۳	توزک تیموری	سبحان بخش	"	۱۸۴۵ء	۸۸۴
۳۴	جغرافیہ ہند (الف)	مترجم شیو روپ نارائن اور سبو نارائن مصنف مرے	"	۱۸۴۸ء	۱۲۲
۳۵	حدائق البلاغت (ف)	منشی شمل لاین فقیر ترجمہ امام بخش صہبائی	"	۱۸۴۲ء	

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
۳۶	خلاصہ التوارخ (الف)	مترجم شیو نارائن مصنف مارشمین	دہلی	۱۸۴۳ء	
۳۷	رسالہ اصول حساب (الف)	مترجم ہردیو سنگھ مصنف ٹی مورگن	"	۱۸۴۷ء	۳۳
۳۸	رسالہ پیمائش زمین	ہر دیو سنگھ	"	۱۸۴۸ء	۴۷
۳۹	رسالہ قواعد اردو	امام بخش صہبائی	"	۱۸۴۵ء	۲۸۶
۵۰	رسالہ مساحت مستعمل و نام سست	پنڈت اجودھیا پرشاد	"	۱۸۴۳ء	
۵۱	رسالہ مقناطیس (الف)	سید کمال الدین	"	۱۸۵۰ء	
۵۲	رہنمائے اصول قوانین	علمائے دہلی کالج	"	۱۸۴۶ء	
۵۳	سریع الفہم	مصنف رام چندر	"	۱۸۴۹ء	۴۳
۵۴	طبیعیات (الف)	مصنف ارناٹ	"	۱۸۴۷ء	۱۹۸
۵۵	عجائبات روزگار	مصنف ماسٹر رام چندر	"	۱۹۴۷ء	

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
۵۶	علم الجبرا (الف)	مترجم ماسٹر رام چندر مصنف برجز	دہلی	۱۸۳۳ء	
۵۷	علم طب	پنڈت رام کشن	”	۱۹۳۷ء	۱۴۲
۵۸	عمل جراحی (الف)	مترجم ہنری ٹیلر مصنف کوپز	”	۱۸۳۸ء	۱۱۹
۵۹	قانون دیوانی کا خلاصہ (الف)	مترجم حسینی مصنف برنسپ	”	۱۸۳۵ء	
۶۰	قانون فوجداری کا خلاصہ (الف)	ماسٹر حسینی مصنف سکیپ ووٹر	”	۱۸۳۵ء	
۶۱	قانون محمدی فوجداری قانون محمدی وراثت کا (الف)	ماسٹر حسینی مصنف میکناٹن	”	۱۸۳۵ء	
۶۲	قواعد المبتدی	مولوی کریم الدین	”		
۶۳	قواعد صرف و نحو (الف)	مترجم پنڈت رام کرشن ڈاکٹر اسپرا نگر کی مدد سے ترجمہ کی۔	”		

نمبر شمار	تصنیف	مصنف ، مترجم	مطبع	سن اشاعت	صفحات
۶۴	قواعد اردو (چشمہ فیض)	مولوی احمد علی	دہلی	۱۸۳۵ء	
۶۵	کھیت کرم (ہندوستان میں زراعت)	کالی رائے	”	۱۸۳۶ء	۱۸۹
۶۶	گلستان	موتی لال	”	۱۸۳۷ء	۹۲
۶۷	محاورات ہند	سبحان بخش	”		
۶۸	مخزن فوائد	مرزا نیاز علی نکہت	”	۱۸۳۵ء	۳۵۷
۶۹	ترید الاحوال باسلام الاحوال علم ندامت (ع)	پنڈت رام کشن	”	۱۸۳۵ء	
۷۰	مفتاح اللغات	سید محمد	”	۱۸۵۱ء	
۷۱	مکتب نما		”	۱۸۵۰ء	۹۰
۷۲	الجواہر	قطب الدین	”	۱۸۳۲ء	۸۷
۷۳	ہدایت نمائے کام پیمائش	کالی رائے	”	۱۸۵۰ء	۲۳

اردو کے سائنسی اور فنیاتی تراجم کا جائزہ

ڈاکٹر اسلم فرخی

سب سے پہلے تو میں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین جناب ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمت میں ہدیہ سپاس پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے ہماری ایک اہم قومی ضرورت کے گونا گوں مسائل کی شدت کو محسوس کیا اور علمی زندگی کی مختلف سطحوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کو ان مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے یکجا کر دیا ، ہم سب اس امر سے واقف ہیں کہ یہ کام کتنا صبر آزما اور دقت طلب ہے لیکن ڈاکٹر اور صاحب اعجاز راہی صاحب نے اس مشکل کو آسان ہی کر لیا ۔

صاحبو ! طارق محمود صاحب کا مقالہ بڑا جامع اور معلومات افزا ہے ۔ انھوں نے ابتدا تا حال کے تمام سائنسی اور فنی تراجم کا اجمالی جائزہ بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے ۔ یہ جائزہ خود صاحب جائزہ کے بقول تشنہ ہے میری دانست میں یہ ان کا انکسار نہیں بلکہ اظہار حقیقت ہے ۔ تاہم انھوں نے اہم کاموں اور تحریکوں کا ذکر کر دیا ہے ۔ یہاں چند امور کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا ۔ میری معلومات کے مطابق ٹامسن انجینئرنگ کالج رڑکی کے علاوہ بمبئی سے بھی انجینئرنگ کی ایک آدہ کتاب کا ترجمہ شائع ہوا تھا ۔ یہ تراجم اگرچہ ابتدائی نوعیت کے تھے تاہم ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ۔ اسی طرح میڈیکل اسکولوں کے لیے میڈیسن کی بعض کتابوں کے تراجم بھی ابتدائی عہد میں کیے گئے تھے جو ان اسکولوں میں رائج تھے یہ ایک مخلصانہ کوشش تھی جو اگر جاری رہتی تو بڑی مفید ہو سکتی تھی لیکن اسکول کالجوں میں تبدیل ہو گئے اور سلسلہ جاری نہ رہ سکا ۔

یہاں میں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنی زبان میں تراجم کے سلسلے میں ان پادری ماہرین تعلیم کی

کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو مختلف مشنری اسکولوں اور کالجوں سے وابستہ تھے اور انھوں نے مختلف علمی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ماہرین تعلیم کی کوششوں کا بھی جائزہ لیا جائے ۔ یہ ایک فراموش شدہ گوشہ ہے میری نظر سے ایک بڑا دلچسپ ترجمہ گزرا ہے ۔ پادری اسکاٹ نے منطق کے سلسلے میں ایک کتاب مرتب کی تھی ۔ ایک صفحے پر انگریزی متن مقابل کے صفحے پر اردو ترجمہ رومن رسم الخط میں ترجمہ سلیس اور معنی خیز ہے ۔ ۱۸۷۷ء میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا اور سرورق پر یہ عبارت بھی درج تھی کہ اس کتاب پر سرکار نے انعام دیا ہے ۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تراجم کی افادیت کے پیش نظر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی ۔

میرا خیال ہے کہ انجمن پنجاب کے ساتھ ساتھ محکمہ تعلیمات حکومت پنجاب کی کوششوں کو بھی علمی کتابوں کے تراجم کے سلسلے میں مدنظر رکھنا ضروری ہے ، میں بے تحقیق یہ تو عرض نہیں کر سکتا تھا کہ محکمہ تعلیمات کی سعی سے کتنی کتابوں کے تراجم ہوئے مگر یہ بات سو فی صد درست ہے کہ تراجم ہوے ضرور کیونکہ خواجہ حالی کا ایک بیان محفوظ ہے جو یہ ہے کہ گورنمنٹ بک ڈپو میں میرے فرائض میں انگریزی سے ترجمہ ہونے والی کتابوں کی زبان درست کرنا شامل تھا اور یہیں میں نے جیولوجی کی ایک کتاب کا جو فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھی ازخود اردو میں ترجمہ کیا ۔ حکومت پنجاب کی کوششوں کا جائزہ اگر مرتب ہو جائے تو یہ ایک مفید کام ہو گا ۔

۱۹۰۷ء سے قبل انجمن ترقی اردو نے بھی تراجم کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا اور بعض بڑی اہم علمی کتابوں کے تراجم مثلاً کانٹ کی تنقید عقل محض شائع کی تھی یہ ترجمہ مثالی حیثیت کا حامل ہے ۔افلاطون کی ریاست اور بعض دوسری علمی کتابوں کے تراجم انجمن نے شائع کیے ہندوستانی اکیڈمی اور جامعہ ملیہ نے بھی بعض اس قسم کے تراجم شائع کیے ۔ لیکن مبسوط اور منظم کوشش انجمن نے کی ۔

قیام پاکستان کے بعد مولوی عبدالحق نے سائنس کے ترجموں کو انجمن کی حکمت عملی کا بنیادی رکن قرار دیا اور سائنس کی اصطلاحات

کے تراجم کی جانب توجہ دی ۔ چنانچہ انجمن نے بعض علوم کی اصطلاحوں کی فرہنگیں مرتب کروائیں اور شائع کیں ۔ جب دوسرے اداروں نے اصطلاحات سازی کا کام شروع کیا اور مختلف جامعات میں دارالترجمے قائم ہو گئے تو انجمن نے اصطلاحات کے تراجم کے کام سے قطع نظر کیا ۔ انجمن نے علمی اصطلاحوں کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ حکومت کے بعض اداروں کے لیے اصطلاحوں کے تراجم کا کام انجام دیا ۔ پاکستان ریلوے کی فرمائش پر انجمن نے ریلوے کی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کیا اور ریلوے نے انہیں استعمال کیا ۔ اسی طرح بینک دولت پاکستان کے لیے بھی انجمن نے اردو میں اصطلاحوں کے ترجمے کیے ۔ سچی بات یہ ہے کہ پاکستان میں سائنسی اور فنی تراجم کا آغاز انجمن ہی کی مساعی سے ہوا ۔ طارق محمود صاحب اگر اس امر کی بھی صراحت کر دیتے تو ان کا جائزہ زیادہ حقیقت پسندانہ ہوتا ۔

سائنسی اور فنی تراجم کے سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ اصطلاحات کے معیار کا ہے ۔ فی الحال صورت حال یہ ہے کہ ایک ہی اصطلاح کا ترجمہ مختلف اداروں نے مختلف انداز سے کیا ہے ۔ اس طرح اصطلاحات میں ایک مزاج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ ہر مترجم اپنی مرضی کے مطابق اصطلاحات استعمال کر رہا ہے جس سے قاری کو صفحہ بہ صفحہ مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اس صورت حال کے سلسلے میں ایک سیدھا اور آسان جواب یہ دیا جاتا ہے کہ کوئی اصطلاح زبردستی مسلط نہیں کی جاسکتی جو رائج اور استعمال ہونے کے لائق ہوگی زندہ رہے گی جو اس قابل نہیں ہو گی وہ اپنی موت آپ مرجائے گی یہ جواب ویسے تو بالکل درست ہے کہ زبان کے رواج کا پیمانہ قبول عام کی سند ہے لیکن سکولوں اور کالجوں کے لیے مرتب کی جانے والی سائنسی کتابوں کے سلسلے میں ہم قبول عام کی سند حاصل ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے ۔ چنانچہ اس مشکل کو رفع کرنے کی غرض سے شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی نے وزارت تعلیمات کی اعانت سے ایک منصوبہ بنایا اور سائنس کے علما کی ایک کمیٹی نے انٹرمیڈیٹ (اعلیٰ ثانوی) کی سطح تک استعمال ہونے والی تمام سائنسی اصطلاحات مرتب کیں بعدازاں ماہرین کی کمیٹی نے ان تمام اصطلاحات کے ترجمے کیے اور ان تراجم پر غور و خوض کیا ۔ نظرثانی کی اور اعلیٰ ثانوی کی سطح تک کی سائنسی اصطلاحات کی ایک لغت تیار کر دی ۔ مقتدرہ قومی زبان

نے یہ لغت شائع کر دی ہے ۔ اس طرح تین اداروں ، شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی ، وزارت تعلیمات اور مقتدرہ قومی زبان کی سعی مشترک سے یہ مسئلہ حل ہوا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ صوبائی نصابی بورڈوں کے لیے اب یہ سہولت ہو گئی ہے کہ وہ سائنس کی کتابوں کے ہر مؤلف اور مترجم کو اس لغت کا پابند کر کے اصطلاحات کے تراجم میں یکسانی اور ایک معیار قائم رکھ سکتے ہیں ۔ اردو کے سائنسی اور فنیاتی تراجم کا جائزہ اس کوشش کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ۔

میں سمجھتا ہوں جامعہ پنجاب ، زرعی جامعہ فیصل آباد، جامعہ پشاور اور بلوچستان کے دارالترجموں کا کچھ جائزہ اور تفصیل چاہتا تھا اس طرف توجہ ضروری ہے ۔

طارق محمود صاحب کی طرح میں اس امر کی صراحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جدید اور قدیم تراجم میں نمایاں فرق ہیں ۔ ایک فرق اسلوب کا اور دوسرا اصطلاحات کا ۔ اسلوب کا سلسلہ یہ ہے کہ آج کی زبان پچاس سال پہلے کی زبان سے مختلف ہو گئی ہے اور وجہ یہ ہے کہ اردو بولنے اور لکھنے والوں کے مزاج میں بڑی تیزی سے تبدیلی ہوئی ہے ۔ آج کا عہد ترجمے اور تخلیق دونوں میں اسلوب کی سادگی کا عہد ہے اصطلاحات کا سلسلہ یہ ہے کہ خود انگریزی میں بھی اصطلاحوں کے مفاہیم بدل رہے ہیں اور نئی تعریفیں جو فطری حقائق اور تجرباتی مشاہدات سے زیادہ ہم آہنگ ہیں سامنے آرہی ہیں لہٰذا وضع اصطلاحات میں ردوبدل بھی ناگزیر ہو گیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ زبان کے نئے مزاج کے مطابق بعض جگہ پرانی اصطلاحوں کو ترک کرکے نئی اصطلاحیں میں وضع کرنا پڑیں گی ۔ اس صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وضع اصطلاحات کا کام جن اصولوں پر جاری ہے اسی طرح جاری رہے ۔ غریب اور نامانوس انداز سے پرہیز کیا جائے ۔ طارق محمود صاحب نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہی موقف اختیار کیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہی صحیح موقف ہے ۔

میں یہ عرض کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ تراجم کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اگر مقتدرہ قومی زبان تراجم کا ایک مخصوص کتب خانہ قائم کرے تو یہ بڑا مفید کام ہو گا اور ایک معقول حد تک

وہ بڑا ذخیرہ جو آہستہ آہستہ ناپید ہوتا جارہا ہے بازیاب ہو جائے گا اور اہل علم ، مترجمین اور محققین کے کام آئے گا ۔

صاحبو! دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح ہمارے یہاں بھی بےشمار مسائل کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے جن کے حل کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل ابھی تک مرتب نہیں ہو سکا - میں سمجھتا ہوں کہ قومی زبان میں سائنسی اور فنی تراجم بھی ایک ایسا ہی مسئلہ ہے جس کے بارے میں ہمارے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل نہیں اور خوشی کی بات ہے کہ مقتدرہ قومی زبان نے اس اہم مسئلے کے سلسلے میں یہ قومی سیمینار منعقد کر کے ایک واضح لائحہ عمل مرتب کرنے کی دعوت عام کی ہے اور یہ ہم سب کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے ۔

اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ

مرزا حامد بیگ

سرسید احمد خاں اپنے عہد کی کرب ناک صورت حال کا بیان اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں :

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا ، نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا ، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا ، اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا"

ادبی اور علمی سطح پر بھی ہمارے ہاں ایک عجیب و غریب کشمکش دکھائی دیتی ہے -

ادیبوں کے ایک گروہ کے خیال میں پیروئ مغرب ہی زندہ رہنے کی واحد صورت تھی -

دوسرا گروہ مغرب کے پیچھے کا زیر بار احسان رہتے ہوئے ابن العربی اور ابن رشیق پر گزارا کرنا چاہتا تھا جبکہ تیسرے گروہ کے خیال میں مغرب سے بھی صاحب سلامت اچھی اور مشرق تو تھا ہی اپنا - سو ۱۹ ویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں ہم مشرق اور مغرب کے درمیان بری طرح ڈگمگاتے پھرے -

لیکن یہ دو طرفہ آگ تھی ، ہمارا ادیب مغرب کی طرف تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور مغرب نے مشرق لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تھی یہ الگ قصہ ہے کہ ہم نے اس کھیل میں پایا کم اور کھویا زیادہ - بقول محمود ہاشمی[1] :

"ایذرا پاؤنڈ میگنا کارٹا کے ساتھ ساتھ مشرق فلسفے اور مشرق شاعری کے تراجم اور حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے - اسی لیے ایلیٹ

rekhta

اپنے خراب اور کارتھیج کے خوابوں کے بعد اوم شانتی شانتی کی منزل تک آتا ہے ۔ اسی لیے سارتر بدھ سے قریب دکھائی دیتا ہے ۔ اسی لیے بیشتر نئے مغربی ادیب بدھسٹ بن گئے تھے'' ۔

اسی لیے ایلن جنسبرگ (Allen Ginsberg) امریکہ سے ہندوستان کا سفر کرتا ہے اور امریکہ میں رہتے ہوئے اپنی نظم میں اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ :

''(America) When will send your eggs to India''

مغرب میں اس میلان کے ابتدائی نقوش مارلو اور شیکسپیئر کے ڈراموں میں دکھائی دیتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ۱۸۸۰ء کے قریب رڈ یارڈ کپلنگ اپنے مشرقی حوالوں کے ساتھ ابھرا لیکن باطنی سطح پر جس نے انگریزی راج کے تصور کو تقویت بہم پہنچائی ۔[۲] کپلنگ سے پہلے میکنزی نے ۱۸۷۵ء میں مسز مشروم کی ذات کے حوالے سے ہندوستان کے باسیوں کا خوب خوب مضحکہ اڑایا اور ہمارے رتن ناتھ سرشار نے اصل حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر اس کی ایک کتاب اعمال نامہ[*] روس کا ترجمہ کیا ۔ سو کہا جاسکتا ہے کہ کپلنگ کی ذہنیت کو پیدا کرنے کے لیے ۱۸۷۵ء سے زمین ہموار کی جا رہی تھی ۔

یہ تو تھی مجمل صورت حال ۔ البتہ اردو میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی وگیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے مثلاً یہ کہ ادبی تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا ، نئے طرز احساس کو اُبھارا ، پیرائیہ بیان میں صلابت ، متانت اور استدلال پیدا کیا اور پیرائیہ اظہار کے لئے نئے سانچے فراہم کیے ۔ نیز یہ کہ نئی نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو نئی وقار بھی بخشا ۔

اردو ادب میں تذکرہ کی جگہ تنقید ، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول ، رہس اور نوٹنکی کی جگہ ڈرامہ اور کہانی کی جگہ افسانے جیسی جدید اصناف نے لے لی اور ادبیات عالم کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا ۔ یہ بعض ہیئت کی سطح پر ہی تبدیلیاں نہ تھیں بلکہ مضمون کے ساتھ ادبی رویہ کی تبدیلیاں بھی تھیں اور قدامت پسندی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر نئے زمانے میں سانس لینے کا جتن بھی ۔

ابتدا میں ادبی سطح پر ہیئت ، تکنیک اور موضوعی کروٹوں سے یہ آشنائی نئی نئی تھی اور مغربی ادبیات کی روایت کا شعور تقریباً ناپید تھا ۔ جس کے نتیجے میں تراجم ہوئے تو ، لیکن انتہائی بے سلیقگی کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں آیا ۔ قاری کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمے کے نام پر کاٹھ کباڑ کے ڈھیر لگا دیے گئے ۔ ایسے ترجموں کا بڑا نقص یہ ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ مستند اور اہم کتب کے ترجمے نہیں تھے ۔ بالخصوص جارج ولیم ۔ ایم ۔ رینالڈز کے بیسیوں ترجمے ہوئے اور مختلف مترجمین نے کیے اور اس پر غضب یہ کہ ترجمہ در ترجمہ ہوئے اور مترجمین نے اصل متن دیکھنے کی زحمت تک گوارانہ کی ۔ یہی صورت ''آزاد ترجمہ'' میں سامنے آئی اور ہمارے مترجمین نے لندن کے بازاروں میں جمن حلوائی اور لکھنؤ کے بانکوں کو جدی پشتی وہاں کا ثابت کردیا۔ کرداروں کے نام اور جگہوں کے آثار تو تبدیل ہوئے ہی ، ان کے عادات و خصائل تک بدل گئے ۔

مترجمین کی ترجمے کے فن سے ناواقفیت اور تن آسانی نے تراجم میں ایک نیا طرز تحریر بھی ایجاد کیا ، جس کے لیے انگریزی میں (Journalese) کی اصطلاح موجود ہے ، یعنی ایک ایسی ناقص زبان لکھی گئی جو نہ تو خیالات کے اظہار پر قادر ہے اور نہ ہی معنی کی ترسیل پر ۔ یہ اس لیے ہوا کہ مشرق دنیا میں لفظ خاصیت یا داخلی شیئت کا نمائندہ ہے ۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا تھا کہ :

''ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشور علم میں مشرق اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہوگئے ہیں ۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی ۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی''۔

اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مہدی جعفر لکھتے ہیں :

''ملحوظ خاطر رہے کہ بات پانی لانے کی ہے کناروں پر تیرتے ہوئے الفاظ اکٹھا کرنے کی نہیں ۔ تخلیق اور ترجمے میں بہرحال فرق ہے ۔ غیر مغرب والوں نے تو اپنے پانی سے اپنے ہم مزاج الفاظ نکالے ہیں ۔ ہم نے ترجمے کے ذریعے انہیں الفاظ سے شعبدہ بازی یا چونکانے کا کام لیتے ہوئے بے اعتمادی کا ثبوت دیا ہے''۔

مہدی جعفر نے محولہ بالا مضمون میں مشرق اور مغرب کے مزاجوں کی سطح پر فرق کو 'کیمیا گری' اور 'کیمیا دانی' کا فرق قرار دیا ہے - اردو ادب کو تراجم کی معرفت کیمیا گری سے کیمیا دانی کی طرف لانے کا کام یوں تو فورٹ ولیم کالج میں ہونا قرار پایا تھا لیکن اس باب میں بھی سرسید احمد خاں بازی لے گئے - انہوں نے اردو ادب کو جس ذہنیت کا تحفہ دیا اُس کی بنیادیں عقلیت ، اجتماعیت مادیت اور حقائق نگاری پر تھیں[5] -

سرسید کی معرفت مشرق کے لیے مغرب کی اس عطا کی کھوج میں نکلیں تو پتہ چلتا ہے کہ لفظ کی سطح پر ہم داخلیت سے اسی زمانے میں دست کش ہونا شروع ہو گئے تھے جب سے یورپی اقوام نے ہمارے ساحلوں پر اول اول قدم رکھا تھا - نتیجہ یہ نکلا کہ 'نئے' اور 'جدید' ادب تک آتے آتے نہ ہماری زمینی بوباس اپنا پتہ دیتی ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں کے معاشرتی سیاسی اور اقتصادی حوالوں کا نشان ملتا ہے - اردو میں مغربی تراجم کے زیراثر ہمارے افسانوی ادب کو مخصوص نوع کی مغربی روش کا سامنا رہا جس کے باعث ہمارے افسانوی ادب کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اسے بڑی آسانی سے ''اینگلو انڈین'' ادب کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے -

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ادیبوں کو اوائل ۲۰ویں صدی کی قومی تحریکوں کا ہمنوا بن کر ہی ترجمہ کی طرف آنا چاہیے تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں زرق برق مغربی تہذیب اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ مخصوص معاشرتی اور سیاسی حوالوں ، ذہنی رویوں ، ضرورتوں اور انگریزی زبان نیز مغربی ادبیات کے مخصوص پس منظر میں رکھ کر کرنا چاہیے تھا اور یہ بھی کہ اردو زبان کے نئے عہد سے مطابقت رکھنے والی لسانی تشکیل اور اسلوبیاتی دائرہ عمل کے بارے میں منصوبہ بندی کی ضرورت تھی -

محمد حسن عسکری نے اپنے بعض مضامین میں مذکورہ بالا عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو ترجمے کی روایت کو کھنگال ڈالا اور اس کا رد عمل خود اُن کے تراجم ہیں -

اردو میں ترجمہ نگاری کے مروجہ چلن پر عسکری صاحب نے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر ترجموں کے ذریعے ہمارے تخلیقی ادب کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ ہمارے

مترجمین ، ترجمے کی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر اسے تخلیقی مسئلہ نہیں سمجھتے - ترجمے کا جواز محض موضوع یا کہانی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں ، اصل بات تو ترجمے کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالنے اور رائج کرنے سے پیدا ہوتی ہے -

بات دراصل یہ ہے کہ خواہ رتن ناتھ سرشار کا سروانتیس سے ترجمہ ''خدائی فوجدار''[7] ہو یا قیسی رام پوری کا رینالڈز سے ترجمہ ''فسانہ لندن''[8] ہمارے ہاں آزاد ترجمے کی روایت نے بڑے بڑے گل کھلائے ہیں اور ترجمے کے مذاق کو خراب کرنے میں انھی آزاد ترجموں کا ہاتھ رہا ہے - پھر اردو نثر اور بالخصوص افسانے پر آسکر وائلڈ اور دیگر مغربی جمال پرست ادیبوں کے غالب اثر کی مذمت کی جاتی ہے اور اسے اردو نثر کی اسلوبیاتی روایت کے لیے نقصان دہ قرار دیا جاتا ہے - یہ بات مکمل طور پر قبول نہیں کی جا سکتی - جہاں تک تراجم کے زیر اثر زبان کو بڑھاوا دینے کا معاملہ ہے اس میں جمال پرست ادیبوں کی عطا سے انکار کیسے ممکن ہے ؟ جب کہ اُن میں مولانا حامد علی خاں ، لطیف الدین احمد جلیل قدوائی ، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ منظور حسین جیسے نام آتے ہیں -

مجموعی طور پر دیکھیں تو پریم چند کے فوراً بعد مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں ایڈگر ایلن پو کے زیر اثر تحیر اور اسرار کی جو انوکھی فضا بندی دیکھنے میں آتی ہے وہ تکنیکی اور موضوعی حوالوں کے ساتھ اسلوبیاتی سطح پر بھی خاصے کی چیز ہے جبکہ مجنوں کے افسانے جہاں اسلوبیاتی سطح پر فکر محض کی زبان کو اردو فکشن میں پہلی بار متعارف کروانے کے سلسلے میں یادگار ہیں ، وہیں پر اُن کی گہری سنجیدگی اور محسوسات کے بیان پر قدرت ، انگریزی اور دیگر مغربی ادبیات سے گہری شغف پر دال ہے ۔ خیر یہ تو ہوئیں اثر و قبول کی دو ایک مثالیں۔لیکن جہاں تک اسلوبیاتی سطح پر رد و قبول کا معاملہ ہے تو ہمارے ہاں کے مترجمین نے ہمیشہ ''روانی'' اور 'سلاست' کی ہی تمنا کی ہے اور ہمارے اکثر ناقدین نے اسی روانی اور سلاست کو ترجمے کی خوبی گنوایا ہے ۔ حالانکہ بڑا مترجم وہ ہے جو متمول زبانوں سے ترجمہ کرتے وقت

یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی اپنی غریب زبان کے رہتے ہوئے کھائیے بھر جائیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے محمد حسن عسکری نے فلابیر، محمد سلیم الرحمان نے ہومر اور مظفر علی سید نے لارنس کو ترجمہ کرتے وقت گنجلک اور طویل جملوں کو اردو جیسی بے مایہ زبان میں منتقل کرنے کا جتن کیا ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر مترجمین نے روانی اور سلاست کے پیچھے بھاگتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ اردو نثر کا بڑا مسئلہ تو طویل اور پیچیدہ جملہ لکھنے کا ہے اور اگر کسی ترقی یافتہ زبان کے فن پارے میں تخلیق کار نے پیچیدہ تر احساسات و جذبات کو لفظوں میں منتقل کرتے وقت یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو کوشش کر کے اسے انہی قواعد و ضوابط کے ساتھ اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا جائے؟ اس سے ہماری زبان میں بھی اسلوبیاتی سطح پر کوئی نئی راہ سوجھنے کا امکان پیدا ہوتا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ اردو نثر میں گنجلک تجربات اور پیچیدہ جذبات و تجربات کو سہارنے کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے "اور" "اگر" "لیکن" وغیرہ لگا کر جوڑتے چلے جانے سے بڑا جملہ نہیں بنتا ہے۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان اور ادبیات نے ترجمے کے ایک عظیم جوکھم سے نبرد آزما رہنے کے باوجود خاطر خواہ حد تک فائدہ نہیں اٹھایا۔

اب آیئے سرسری طور پر یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ہماری مختلف اصناف ادب نے ترجمہ کے زیراثر کیا کچھ منفی اور مثبت اثرات قبول کیے۔

ناولوں کے متعدد تراجم ہو چکنے کے باوجود شروع شروع میں ہمارے ہاں داستان، تمثیل اور ناول میں فرق مٹا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ ہم ایک مدت تک نذیر احمد دہلوی کے تمثیلی قصوں کو ناول قرار دیتے رہے اور نذیر احمد دہلوی کے سر اولین ناول نگار ہونے کا سہرا باندھتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مغربی ناول نگاروں خصوصاً وکٹر ہیوگو، الگزنڈر ڈوما، زولا، بالزاک، اناطول فرانس اور اسکاٹ وغیرہ کے تتبع میں نذیر احمد دہلوی کے ساتھ رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، شاد عظیم آبادی، سجاد عظیم آبادی، راشدالخیری اور مرزا ہادی رسوا اردو میں ناول نگاری کے چلن کو عام کرنے میں مصروف تھے۔

نذیر احمد دہلوی کی تمثیلیں اسٹی ون سن کے ٹریژرر آئی لینڈ کی طرح ہر قسم کی بداخلاق حتیٰ کہ حسن و عشق سے بھی خالی ہیں۔ نذیر احمد پر دوسرا بڑا اثر جارج ایلیٹ کے ناولوں کا تھا خصوصاً کردار کی پیش کش میں نفسیاتی تجزیہ نگاری جو جارج ایلیٹ ہی سے مخصوص ہے، جب کہ بنات النعش، ٹامس ڈے کا چربہ ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد[9]، اور خدائی فوج دار، ہر دو تحریریں سروانتیس کے ڈان "کیہوٹے" سے جنم لیتی ہیں اور کچھ یہی معاملہ سجاد حسین کے "حاجی بغلول" کا ہے۔ ہمارے اولین ناول نگار عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناولوں کی تمام تر عمارت سروالٹر اسکاٹ اور رچرڈ سن کی بنیادوں پر کھڑی ہیں جب کہ انہوں نے ایک باقاعدہ ترجمہ رینالڈس کے ناول کا "خوبیٔ قسمت" کے نام سے کیا۔ اسلوبیاتی سطح پر شرر نے بے قافیہ شاعری کرتے ہوئے مصرعوں کو ایک آزاد تسلسل میں مربوط رکھنے کا جتن کیا ہے جو سراسر اسکاٹ سے مخصوص ہے۔ سروالٹر اسکاٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسلوبیاتی سطح پر اسکاٹ کے اثرات شرر سے حکیم محمد علی خاں تک پہنچے جنہوں نے ناول کو "ادب لطیف" بنانے کی کوشش کی۔

مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی کے پانچ جاسوسی ناولوں کو "خونی بھید" "خونی جورو" "خونی مصور"، "خونی عاشق" اور "بہرام کی رہائی" کے نام سے ۱۹۲۸ء تک ترجمہ کر کے طبع بھی کر دیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنی طبع زاد تحریروں میں جاسوسی عنصر کو شامل نہیں ہونے دیا، یہ اثر بعد ازاں ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ سراغ رسانی کے ادب میں ڈھل گئی اور تیرتھ رام فیروز پوری کے طبع زاد ناول اس سے اگلا قدم ہیں۔

مغرب کے معروف ناول نگاروں میں آر۔ ایل اسٹیونسن (مترجم: مولانا عبدالمجید سالک) ارنسٹ ہیمنگوے (مترجم: اشفاق احمد - ابن سلیم - بشیر ساجد) ارونگ سٹون (مترجم: سید قاسم محمود) اسٹیفن کرین (مترجم: انتظار حسین) اشروڈ اینڈرسن (مترجم: محمد حسن عسکری) اگنات ہرمن (مترجم: حمید اختر) البرٹو موراویا (مترجم: ایس - اختر جعفری) البیر کامیو (مترجم بشیر چشتی - ڈاکٹر افضل اقبال - محمد عمر میمن - انیس ناگی) الفرڈ نیو مین (مترجم: خواجہ

عبدالکریم) الگزینڈر ڈوما (مترجم : تیرتھ رام فیروز پوری) اناطول فرانس (مترجم : مولوی عنایت اللہ دہلوی ۔ عبدالرزاق ملیح آبادی) او ۔ ہنری (مترجم : ابن انشا ۔ سلیم صدیقی) ایڈگر ایلن پو (مترجم : ابن انشا) ایڈگر رائس (مترجم : ایم ۔ جے ۔ عالم) ایرچ سیگل (مترجم : ستار طاہر) ایرک میریا ریمارک (مترجم : احسن طاہر) ایف ۔ ایل ۔ گرین (مترجم :ابو سعید قریشی) ایلزبتھ کوائس ورتھ (مترجم : مولانا عبدالمجید سالک) ایمائل زولا (مترجم : سید حسن رضوی) ایوان بنین (مترجم : نذر صدیقی) بالزاک (مترجم : سیدہ نسیم ہمدانی ۔ یوسف عباسی) بی ۔ ایم ۔ کول (مترجم : اسرار زیدی ۔ آفتاب احمد بسمل) پرل ۔ ایس ۔ بک (مترجم : اختر حسین رائے پوری ۔ ابو سعید قریشی ۔ تمر نقوی ۔ احسان علی ۔ یوسف ظفر ۔ ن ۔ م ۔راشد) ٹامس ہارڈی (مترجم : مجنوں گورکھپوری ۔ رئیس احمدجعفری شفیق بانو منہاج) جارج ایلیٹ (مترجم : محمد سعید) جارج ولیم ایم رینالڈز (مترجم : تیرتھ رام فیروز پوری ۔ مولانا ظفر علی خان ۔ عبدالحلیم شرر ۔ امیر حسن کارکوروی ۔ کندن لال شرر ۔ صدیق احمد ۔ اثر لکھنوی ۔ نوبت رائے نظر ۔ بابو پرشاد ۔ شمیم بلہوری ۔ لالہ دینا ناتھ) جان سٹین بک (مترجم: ابن انشا۔ ممتاز شیریں زہرہ ۔ سیدین ۔ مظہر انصاری) جان ماسٹرز (مترجم: سید قاسم محمود)جوہان ہنرج پستالوزی (مترجم:غلام حسین) جے۔بی وڈ ہاؤس (مترجم : ستار طاہر) جیک شیفر (مترجم : شان الحق حقی ۔ غلام حسین) چارلس ڈکنز (مترجم : خان احمد حسین خان ۔ فضل الرحمٰن) ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس (مترجم : سیدہ نسیم ہمدانی) رڈ یارڈ کپلنگ (مترجم : مولانا ظفر علی خان ۔ مولوی عنائت اللہ دہلوی) ساؤمنگ (مترجم : محمد خلیق) ستاں دال (مترجم : محمد حسن عسکری) سمرسٹ ماہام (مترجم : ڈاکٹر سید محمد عقیل) سنیکاونٹر لوئیس (مترجم : عابد علی عابد) سروانتیس (مترجم : رتن ناتھ سرشار۔سجاد حسین) شارلٹ برانٹے (مترجم : سیف الدین حسام) فرانسوا سا گاں (مترجم : ستار طاہر) گستاؤ فلابیئر (مترجم : محمد حسن عسکری) مولوی عنایت اللہ دہلوی) فیلکن سالٹن (مترجم : ظہور الحسن ڈار) کرسٹو فرا شروڈ (مترجم : محمد حسن عسکری) کلیمنس ڈے (مترجم : جاوید شاہین) اور کینتھ رابرٹس (مترجم : سید قاسم محمود) گوڈفرے لیاس (مترجم : شاہد احمد دہلوی) گوئٹے (مترجم : میاں محمد افضل ۔ احمد ندیم قاسمی) لوئیزا الکاٹ (مترجم :

حجاب امتیاز علی تاج ۔ اشرف صبوحی) لوئیس بروم فیلڈ (مترجم : مولوی عنایت اللہ دہلوی) لوئیس سنکلیر (مترجم : عابد علی عابد) مس کون کونسٹ (مترجم : صادق الخیری) موپاساں (مترجم : سید قاسم محمود ۔ نصیر حیدر نوح فاروق ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۔ طاہر قریشی) میتھوز ٹیلر (مترجم : محمد رئیس الزماں خاں رئیس) نیتھنیل ہا تھارن (مترجم : سیدہ نسیم ہمدانی) نٹ ہیمسن (مترجم : عشرت رحمانی) سروالٹراسکاٹ (مترجم : عبدالحلیم شرر) وکٹر ہیوگو (مترجم : سعادت حسن منٹو ۔ رام سروپ شرما ۔بشارت انور) والٹیئر (مترجم : سجاد ظہیر ۔ بشیر ساجد) ولیم سرویان (ن ۔ م ۔ راشد ۔ شفیق الرحمٰن ۔ سید رضی ترمذی (پال کین (مترجم : ایم۔اسلم ہاورڈ فاسٹ (مترجم : انیس اعظمی ۔ احسن علی خاں) ہرمن میلول (مترجم : محمد حسن عسکری) ہنری جیمز (مترجم : قرۃ العین حیدر) ہنری رائیڈر ہیگرڈ (مترجم : سلمیٰ تصدق ۔ مولانا ظفر علی خاں ۔ مظہر الحق علوی ۔ آغا اقبال ۔ بشیر احمد اختر ۔ منشی خلیل الرحمٰن ۔ عاصم صحرائی ۔ ثریا اقبال ۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی) ہیرلڈلیم (مترجم : عزیز احمد ۔ گلزار احمد ۔ احمد یوسف عباسی ۔ جمیل نقوی ۔ اختر عزیز اختر ۔ غلام رسول مہر ۔ وزیر الحسن عابدی ۔ سید ہاشمی فرید آبادی ۔ محمد ہادی حسین ۔

یہ چند ایسے نام ہیں جن کے اردو میں ترجمے سے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ ناول کا چلن عام ہوا بلکہ ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی سمجھنے میں مدد ملی ۔

پارسی اسٹیج کے فروغ کے ساتھ ہی انگریزی سے اسٹیج ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا اور ولیم شیکسپیر کی عالمگیر شہرت سے باکس آفس پر کامیابی کا تصور بندھا لیکن افسوس کہ شیکسپیر کے بیشتر تراجم ناقص ہیں ۔ ان میں پلاٹ کی تبدیلیاں کی گئیں ، مقامی رنگ میں اس قدر رنگ دیا کہ پہچان مشکل ہو گئی ، یہاں تک تجارتی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بڑے پیمانے پر کانٹ چھانٹ بھی کی گئی اور اس فعل قبیح میں آغا حشر کاشمیری بھی شامل تھے کنگ لیئر (King Lear) کا ترجمہ ''سفید خون'' اس کی ایک مثال ہے ۔ سو ڈرامہ کے باب میں ہمارا پہلا قدم ہی غلط پڑا ، کہا جا سکتا ہے کہ باکس آفس پر کامیابی کی خواہش نے ہمیں مغربی ڈرامے کی فنی خوبیوں سے دور رکھا ۔

یہ اس کے باوجود ہوا کہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنی کتاب ''ہندوستانی زبان کی قواعد''[۱۱] (مطبوعہ ۱۷۹۶ء) میں شیکسپیر کے ''ہنری ہشتم'' اور ''ہملٹ'' کے دو طویل اقتباسات ترجمہ کرکے شامل کتاب کیے تھے۔

سوائے جولیئس سیزر کے دو ترجموں از عزیز احمد اور سید فیضی، ''رومیو جولیٹ'' کے دو ترجموں عزیز احمد اور مولوی عنایت اللہ دہلوی، ''اوتھیلو'' کے ایک ترجمے از عزیز حامد مدنی اور ''انطونی و قلو پطرہ'' کے ایک ترجمے از شان الحق حقی کے کسی ترجمے کی داد نہیں دی جا سکتی جبکہ شیکسپیئر کے ہمارے ہاں دو سو سے زائد ترجمے ہوئے۔ یہاں تک کہ مارس میترلنک کے ترجموں از محمد عمر و نورالٰہی کی بھی یہی صورت ہے۔

دیگر ڈرامہ نگاروں کے ترجموں میں فاؤسٹ از گوئٹے (مترجم: ڈاکٹر عابد حسین) ''بگڑے دل'' از مولیئر (مترجم: محمد عمر و نورالٰہی) ''سلمٰی'' از آسکر وائلڈ (مترجم: انصار ناصری) ''ظاہر و باطن'' از شیریڈن (مترجم: فضل الرحمٰن) چند ایسے ترجمے ہیں جن کے طفیل آگے چل کر اردو ڈرامے کو رفیع پیر، خواجہ معین، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ جیسے ڈرامہ نگار مل گئے۔

دیگر معروف ڈرامہ نگاروں میں آسکر وائلڈ (مترجم: مجنوں گورکھپوری تمکین کاظمی۔ شاہد احمد دہلوی۔سعادت حسن منٹو و حسن عباس) آندریف (مترجم: ابو سعید قریشی) تھارلٹن وائلڈر (مترجم: انتظار حسین۔ عشرت رحمانی) ٹالسٹائی (مترجم: مجنوں گورکھپوری) جارج برنارڈ شا (مترجم: مخدوم محی الدین و مولوی میر حسن۔مجنوں گورکھپوری۔ محمد اکبر وفاقانی۔ خورشید نگہت) جان گالزوردی (مترجم: سید قاسم محمود منشی جگت موہن لال رواں۔ دیانرائن نگم) جے۔ بی پرسٹیلے (مترجم: اظہار کاظمی۔ محمد خالق) آرچرڈ (مترجم: مخدوم محی الدین) دانتے (مترجم: مولوی عنایت اللہ دہلوی۔ عزیز احمد) دوستو فسکی (مترجم: کمال احمد رضوی) رچرڈ ہنٹ (مترجم: بدر جہاں آراء) سمرسٹ ماہام (مترجم: محمد اکبر وفاقانی) سمولوف (مترجم: عبداللہ ملک) سوفوکلینر (مترجم: شاہدہ حمید خاں) شلر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی) گوئٹے (مترجم: شاہد احمد دہلوی۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ عبدالقیوم خان باقی۔ منور

لکھنوی۔ عزیز احمد) لیسنگ (مترجم: منشی جگت موہن لال رواں۔ منشی محمد نعیم الرحمان) مارس میترلنک (مترجم: نور الٰہی و محمد عمر۔ مجنوں گورکھپوری۔ وحشی محمود آبادی۔ شاہد احمد دہلوی) ماس ہارٹ و جارج ایس کافمین (مترجم: سید رضی ترمذی۔ کمال احمد رضوی) مولیئر (مترجم: وہاج الدین۔ محمد عمر و نور الٰہی) میری چیز (مترجم: کمال احمد رضوی) ہنرک ابسن (مترجم: عبدالشکور۔ فضل الرحمٰن۔ عزیز احمد۔ محمد صفدر) ہنری رائیڈر ہیگرڈ (مترجم: آغا اقبال) وغیرہ کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

افسانے کی صنف میں تین نام بہت ترجمہ ہوئے یعنی چیخوف۔ موپاساں اور رابندر ناتھ ٹیگور۔ ٹیگور کو انگریزی کی معرفت اردو میں متعارف کروانے میں پریم چند پیش پیش تھے اور یہ سلسلہ منٹو تک چلا آیا۔ منٹو نے چیخوف اور موپساں کو نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ ان کے طرز تحریر کو عام کرنے میں حصہ لیا اسی طرح ٹالسٹائی اور گورکی بھی منٹو کی معرفت اردو میں متعارف ہوئے۔

چیخوف، موپاساں اور مارس میترلنک کے ترجموں کی عطا راجندر سنگھ بیدی۔ منٹو اور غلام عباس ہیں۔ ایڈگرایلن پو اور او ہنری کو بھی ہمارے ہاں خصوصی توجہ دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ ایڈگر ایلن پو کے ابتدائی تراجم کے فوراً بعد اسی طریقۂ کار کی جھلک مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے ہاں دیکھنے کو ملی۔

سمرسٹ ماہام جیسے دوسرے درجے کے افسانہ نگار کو ہمارے ہاں سادہ زبان اور سہل انداز نگارش کے باعث مقبولیت حاصل ہوئی۔ ماہام سے اثر پذیری کی سب سے بڑی مثال کرشن چندر کے افسانے ہیں۔ روسی افسانہ نگاروں کا واضح اثر پروفیسر محمد مجیب کے اولین افسانوی مجموعے ''کیمیا گر اور دوسرے افسانے'' (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں دیکھنے کو ملا۔ لطیف الدین احمد اور جلیل قدوائی ترجمہ اور طبع زاد افسانے کی ملی جلی صورتیں سامنے لاتے رہے۔[۱۲] اختر حسین رائے پوری کا افسانوی مجموعہ 'محبت اور نفرت' واضح طور پر روسی افسانوں کے اثر کے تحت لکھا گیا اور افسانوں کی انتھالوجی انگارے، مرتبہ: احمد علی میں جیمز جوائس، ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور گستاؤ فلابیئر کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔

معروف افسانہ نگاروں میں اسٹیفن کرین (مترجم : جاوید صدیقی) ایڈگر ایلن پو (مترجم : ابن انشا) اینڈرسن (مترجم : ریاض جاوید) سروانٹیس (مترجم : رحیم) پرل ۔ ایس ۔ بک (مترجم:قمر نقوی (یوسف ظفر) ٹامس ہارڈی (مترجم : مجنوں گورکھپوری) جیک لنڈن (مترجم : انور عنایت اللہ) رابندر ناتھ ٹیگور (مترجم : منصور احمد ۔ حامد اللہ افسر ۔ پرتھوی راج نشتر) اسٹیفن کرین (مترجم : جاوید صدیقی) موپاساں (مترجم نصیر حیدر) موریس لیول (مترجم : امتیاز علی تاج) واشنگٹن ارونگ (مترجم : نیاز فتح پوری ۔ غلام عباس ۔ سید وقار عظیم) کے کتابی صورت میں مطبوعہ تراجم نمایاں ہیں ۔

سفرنامہ کی صنف ہمارے ہاں نئی نہیں اور نہ ہی ہمارے ہاں مغربی سفر ناموں کے تراجم خاطر خواہ حد تک ہوئے ، لیکن ہمارا سفرنامہ لکھنے والوں پر مغربی سفر نامے کے اثرات نمایاں ہیں ، شاید اس کی ایک وجہ جدید سفر ناموں کی مغربی فضا بھی ہو ، یہی وجہ ہے کہ آج کا اردو سفر نامہ اپنی قدیم روایت کے مقابلے میں سفر نامہ کم اور 'ویو کارڈ' زیادہ دکھائی دیتا ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی سفر ناموں کی طرح کا تہذیبی مزاج ہمارے سفر ناموں میں تاحال پیدا نہیں ہوسکا ، اتنا بھی نہیں جتنا چوسر اور مارجری کیمپ کی تحریروں میں تھا حالانکہ وہ سفر نامے میں ان کے ابتدائی نام ہیں ۔ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ مستنصر حسین تارڑ کی طرح 'ڈان جو آن' بننے کی کوشش کی گئی اور کتاب کو بیسٹ سیلر بنانے کی فکر کی گئی ۔

اردو میں ترجمہ ہونے والے سفر نامہ نگاروں میں جنرل گارڈن ، ڈاکٹر وی میکنزی ، ہنری ، ایم اسٹینلے ، کالیر ، جے ۔ بی ٹیونیر لیڈی ڈفرن (مترجم : محمد مظہر) رسل ارون (مترجم : مرتضیٰ احمد خان میکش) پروفیسر ویمبری ، مسز میکس ملر (مترجم: سید رشید الدین) سر آورل اسٹن (مترجم : سید محمود اعظم فہمی) آر ۔ ایف برٹن (مترجم : محمد انشاء اللہ) ایڈمنڈ اسٹیونسن ، لیڈی ایولن کیولڈ زینب (مترجم : محسن شیر) پرنس البرٹ (مترجم : پنڈت بشمبھر ناتھ) موسیو تھیونیو ، جان ہیٹن (مترجم : ٹی ہیری و یونس سنگھ) جان لوئس برکھارٹ ، میجر جنرل جان میلکم (مترجم : محبوب عالم) جولزورن اور میجر ولیم گفرڈ کے نام کتابی تراجم میں نمایاں ہیں ۔

اردو ادب میں منظوم ترجمے کی روایت نظم طباطبائی کی ''گورغریباں'' سے آغاز ہوتی ہے جو گرے کی مشہور ایلیجی کا منظوم ترجمہ ہے ، یہ ترجمہ عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر کیا گیا اور پہلی بار جولائی ۱۸۹۷ء کے رسالہ 'دلگداز' میں شرر کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ۔

نظم طباطبائی نے اس ترجمے کی مقبولیت کے پیش نظر کئی ایک ترجمے اور بھی کیے خصوصاً زمزمۂ فصل بہار (گرے) اور ''دولت خداداد افغانستان'' (سر آلفریڈ لائل) کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ضامن کنتوری نے انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کا مجموعہ 'ارمغان فرنگ' ۱۹۰۱ء میں شائع کروایا ۔ یوں رسالہ 'دلگداز' کی تحریک نے زور پکڑا اور جب اپریل ۱۹۰۱ء میں 'مخزن' کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے اغراض و مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا :

''انگریزی نظموں کے نمونے پر طبعزاد نظمیں ، انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تاکہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں ۔''

سو 'مخزن' کے پہلے ہی شمارے میں اقبال کی نظم 'ہمالہ' پر ایڈیٹر کے نوٹ میں لکھا گیا کہ شاعر نے ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالیہ سے مکالمہ کیا ہے ۔ اسی شمارے میں مولانا ظفر علی خان نے ٹینی سن کی نظم کا 'ندی کا راگ' کے عنوان سے منظوم ترجمہ پیش کیا تھا ۔

اقبال نے ٹینی سن ، لانگ فیلو اور ولیم کاوپر کی متعدد نظموں کے ترجمے کیے جن میں 'پیام صبح' 'عشق اور موت' اور 'رخصت اے بزم جہاں' بہت نمایاں ہیں ۔ 'پرندہ اور جگنو' پرندے کی فریاد اور 'ماں کی تصویر دیکھ کر' تینوں نظمیں ولیم کاوپر سے ترجمہ ہیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ عبدالحلیم شرر کی تحریک کو نظم طباطبائی کے بعد اقبال اور 'مخزن گروپ' کے شعرا نے بڑھاوا دیا اور منظوم ترجموں کی تحریک سے تعاون کرنے والوں میں محمد حسین آزاد ، حسرت موہانی ، عزیز لکھنؤی اور حافظ محمود

rekhta

شیرانی جیسے نام شامل تھے ، ایک سرسری فہرست دیکھتے چلیے ۔

محمد حسین آزاد : اندھی پھول والی کا گیت (لارڈ لٹن)
اجڑا ہوا گھر (ایک انگریز شاعر)
بہار کا آخری پھول (ٹامس مور)

حسرت موہانی : 'موسم بہار کا آخری پھول' (ٹامس مور) 'ترانہ محبت' (انگریزی سے) ۔

ظفر علی خاں : 'ندی کا راگ' (ٹینی سن) 'وفا' (ورڈس ورتھ) ۔

عزیز لکھنوی : مئی کا جوان چاند (ٹامس مور) ۔

غلام بھیک نیرنگ : تربت جاناں ، مقصد الفت ، عالم پیری اور یاد ایام، انجام محبت ، جان شیریں (انگریزی سے) ۔

نادر کاکوروی : مرحومہ کی یاد میں اور گزرے زمانے کی یاد (ٹامس مور) ۔

ضامن کنتوری : بگل کی صدا ، اینک آرڈن (ٹینی سن) ۔

حافظ محمود شیرانی : موت کا وقت (انگریزی سے) ۔

تلوک چند محروم : نغمات (شیکسپیئر) کوئل (ورڈس ورتھ) لسب (ہارڈی) یونان کے جزیرے (لارڈ بائرن) ۔

باقاعدہ انتھالوجیز کی صورت میں ضامن کنتوری کی کتاب 'ارمغان فرنگ' (مطبوعہ : ۱۹۰۱ء) ، نادر کاکوروی کی کتاب 'جذبات نادر' (مطبوعہ : ۱۹۱۰ء) غلام محی الدین کی مرتب کردہ کتاب 'دو آتشہ' کو اولیت حاصل ہے ۔ خیر یہ تو ہوئی متقدمین کی مثال متوسلین میں بکھرے بکھرے تراجم کے علاوہ میراجی نے اپنی کتاب 'مشرق و مغرب کے نغمے' مرتب کرکے جدید مغرب کی طرف دریچے وا کر دیے ہیں ۔[۲]

یہ تو ہوا ایک مختصر جائزہ ، تفصیل میں جائیں گے تو بقول فراق یہ قصہ طولانی ہے ، ادبیات عالم میں ترجمے کے ذریعے اخذ و استفادہ کا انقلاب آفریں سلسلہ جاری و ساری ہے ، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم ترجمے کے تمدن کے ہمہ گیر اثرات کو کس طرح قبول کرتے ہیں ۔

پیروی مغرب بہت ہو چکی ، مغربی پیپے کے زیر بار احسان ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ، کیا ہم اب بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں کیمیا دانی سے کیمیا گری کی طرف جانا ہے ؟

حوالہ جات

۱ ۔ ''ایک خطرناک میلان'' از محمود ہاشمی ، مطبوعہ : 'اوراق' لاہور شمارہ نمبر ۳، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۱۹ ۔

۲ ۔ کپلنگ کے ۱۸۹۱ء تک کہانیوں کے چار مجموعے سامنے آئے جن میں ۹۶ کہانیاں ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک کہانی بھی ایسی نہیں جس میں ہندوستان کی آزادی کی طرف کوئی اشارہ ہو ۔ ''Naulakha'' اور ''Kim'' (ناولوں) میں بھی ہندوستانی فکر کی صحیح عکاسی نہیں کی گئی ۔

۳ ۔ ''گردش آفاق'' ، ''نظارہ پرستان'' ، ''فسانۂ لندن'' ، ''فریب حسن'' (مترجم : منشی تیرتھ رام فیروز پوری) ''فسانۂ لندن'' ایک جلد (مترجم : مولانا ظفر علی خاں) ''مسٹریز آف لندن'' (مترجم : منشی کندن لال شرر) ''فسانۂ الہ دین و لیلیٰ'' ''فریب حسن'' ، ''فسانۂ لارنس ورتھ'' (مترجم : منشی امیر حسن کاکوروی) ''روز المبرٹ'' (مترجم : اثر لکھنوی) ''باپ کا قاتل'' (مترجم : شمیم بلھوری) ''چاک گریباں'' (مترجم : منشی بابو پرشاد) ''شام جوانی'' (مترجم : نوبت رائے نظر لکھنوی) ''جھیل کی معشوقہ'' (مترجم : لالہ دینا ناتھ) ۔

۴ ۔ ''اردو افسانے کے افق'' از مہدی جعفر ، مطبوعہ ''اوراق'' لاہور مئی، جون ۱۹۸۳ء ، ص ۳۵۷ ۔

۵ ۔ دیکھیے : ''سرسید کا اثر ادبیات اردو پر'' از سید عبداللہ ، ڈاکٹر مشمولہ : ''بہترین ادب'' مرتبہ : میرزا ادیب ، مکتبہ اردو لاہور ۱۹۵۵ء ، ص ۱۱ ۔

۶ ۔ ''گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے'' مطبوعہ ''ماہ نو'' کراچی فروری ۱۹۵۴ء ۔

(ب) ''کچھ ترجمے کے بارے میں'' مطبوعہ ''ماہ نو'' لاہور عسکری نمبر مارچ ۱۹۷۸ء۔

(ج) ''کچھ اردو نثر کے بارے میں'' مشمولہ ''ستارہ یا بادبان'' از محمد حسن عسکری۔

۷ - ''خدائی فوجدار'' مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنو ۱۹۰۳ء۔

۸ - ''فسانۂ لندن'' (Mysteries of London) کا ترجمہ ۱۰ جلدیں طبع اول نرائن دت سہگل لاہور طبع دوم : (۱۳ جلدیں، ص ۱۷۰۰) ایشیا بکڈپو خاک خانۂ وطن لاہور ۱۹۲۷ء۔

۹ - ''فسانۂ آزاد'' مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ طبع اول : ۱۸۸۰ء آخری ایڈیشن : ۱۹۳۴ء۔

۱۰ - ''سفید خون'' ترجمہ : آغا حشر کاشمیری طبع اول : ۱۹۰۶ء طبع دوم اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔

۱۱ - ''ہندوستانی زبان کی قواعد'' از ڈاکٹر جان گلکرسٹ طبع اول : کلکتہ ۱۷۹۶ء طبع دوم : مجلس ترقی ادب لاہور۔

۱۲ - دیکھیے افسانہ : ''بیوی'' ازل احمد اکبر آبادی (لطیف الدین احمد) مطبوعہ ''نقوش'' لاہور یہ افسانہ روسی افسانہ نگار P. Romanov سے بحذف و اضافہ مستعار ہے۔

۱۳ - حال ہی میں شان الحق حقی نے مشرق و مغربی منظوم تراجم کا مجموعہ درپن شائع کروایا ہے۔

اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

اس مضمون کی دو بنیادی جہتیں ہیں۔ اس کا مرکز وہ فہرستیں ہیں، جن کے ذریعے اردو میں ادبی تراجم کے مختلف ادوار کا نقشہ مرتب ہوتا ہے اور ان فہرستوں کے اردگرد وہ سوال چھپے ہوئے ہیں، جو مضمون نگار کے خیال میں ادبی تراجم کے اس تاریخی جائزے سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کا مزاج بیک وقت تحقیقی اور نظری ہے۔ باسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مضمون اردو میں ادبی تراجم کے مسائل پر گفتگو کے لیے مناسب تمہید کا کام دے سکتا ہے۔ ہم اپنی گفتگو اس مضمون کی اس بنیادی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض بنیادی مسائل تک محدود رکھیں گے، تا کہ بعض امور کی مزید وضاحت بھی ہو سکے اور بحث کے لیے کچھ اور نکتے مل سکیں۔ نیز مضمون میں دی گئی بعض آرا کا تجزیہ بھی ہو سکے اور ان کے امکانات کو بھی کھنگالا جا سکے۔

۱ - پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس مضمون کا مرکز وہ فہرستیں ہیں، جن کے ذریعے اردو میں تراجم کے مختلف ادوار کا تعارف مقصود ہے۔ ان فہرستوں سے اس موضوع کی وسعت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے اگرچہ یہ فہرستیں مضمون کی حدود کے پیش نظر نسبتاً مختصر ہیں اور مضمون نگار کا مقصد محض فہرست سازی نہیں، مگر ان کے ذریعے مختلف ادوار میں تراجم کی مختلف لہروں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے اور ان ادوار کے مختلف ادبی رویوں سے ان کا کوئی رشتہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے مرزا حامد بیگ نے حال ہی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے تراجم ہی کے موضوع پر مقالہ مکمل کیا ہے اس لیے وہ اس تاریخی تجزیے کے لیے مناسب اہلیت رکھتے

ہیں ۔ چنانچہ یہ فہرستیں اس مسافر کی روداد کی طرح ہیں جو کسی سفر سے لوٹنے کے بعد کسی قدر جوش اور ذرا سی فطری نمائش پسندی سے کام لیتے ہوئے سفر کے عجائب کو بیان کر رہا ہو ۔ ان فہرستوں سے بھرپور استفادہ ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی پرکھ کرتے ہوئے بعض جگہ رک کر سوچتے ہوئے بعض اُلجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور اتنے وسیع موضوع کو کسی درجہ بندی کے دائرے میں لانے کی جس مشکل سے مضمون نگار کو گزرنا پڑتا ہوگا اُس کے پیش نظر یہ اُلجھنیں ان فہرستوں کے معیار پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی ہیں بہر حال چند مقامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم ان اُلجھنوں کی نشاندہی کریں گے ۔

(الف) درجہ بندی کی مشکلات کا ہمیں بخوبی احساس ہے تاہم دانتے کا نام ڈرامہ نگاروں کی فہرست اور ای ایم کول کا نام ناول اور کبھی مغربی ناول نگاروں کی ذیل میں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ۔

(ب) اس طرح کی صف بندی میں ناموں کی کثرت کی وجہ سے اس طرح کی بھاگ دوڑ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ، جو نماز عید میں صفیں درست کرتے ہوئے ہوتی ہے ۔ اگلی صفوں کی ترتیب میں اتنی مشقت ہوتی ہے کہ پچھلی صفوں تک تو نظر ہی نہیں پہنچتی ۔ پچھلے دس سال میں پابلو نرودا ، ینت جان پرس ، ایلیے ، ہرمن ، ہیے ، برتولت بریشت اور مارکیز جیسے ادیبوں کے تراجم کی جو لہر ابھری ہے اس کا کوئی سراغ دکھائی نہیں دیتا اس طرح صادق ہدائیت کے بعض اہم تراجم کا ذکر نہیں ہوسکا ۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے والی نظموں کے کچھ انتخابات کا ذکر تو ہوا ، مگر چند سال پہلے حیدر آباد دکن سے احسن الدین احمد نے ، ساز مغرب ، کے نام سے کئی جلدوں میں مجموعے شائع کیے ہیں ان تک رسائی ہو جاتی تو ترجموں کی جو فہرست خلیل الرحمٰن اعظمی کے

مضمون اردو نظم کا تشکیلی دور کی مدد سے تیار کی گئی اُس میں کچھ اضافہ ہو سکتا تھا ۔

(ج) مرزا حامد بیگ صاحب نے روس سے شائع ہونے والے تراجم کو کیوں نظر انداز کر دیا ان کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے والے تو اردو ہی کے ادیب ہیں ۔ چنانچہ رضیہ سجاد ظہیر اور بالخصوص ظفر انصاری کی کاوشوں کو اس جائزے میں جگہ نہ مل سکی ۔

(د) مضمون نگار نے جائز طور پر اس چیز کو محسوس کیا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ترجموں کے دھارے کا کوئی رشتہ وطنیت اور اس طرح کی تحریکوں کے ساتھ بھی ہونا چاہیے تھا ۔ یہ بہت قابل توجہ مسئلہ ہے ۔ ہم اس سوال میں ذرا وسعت لاتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ بنیادی طور پر تہذیبی ضرورتوں سے پیدا ہوتا ہے ، سیاست اُس کا ایک رخ ہے مگر صرف ایک ہی رخ ہے اس سلسلے میں انتہا پسندی پچھلے کئی سالوں سے دیکھنے میں آ رہی ہے کہ بعض حلقوں میں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس ترجمے کا آج کل کے حالات میں جواز کیا ہے اور جواز سے مراد بالعموم سیاسی جواز ہی ہوتا ہے اور اس جواز کو بھی بہت ہی سادہ معنی دیے جاتے ہیں ۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مضمون نگار جس دھارے کے تراجم کی بات کر رہے ہیں وہاں بھی ایک جہت ضرور ایسی تھی جس میں حب وطن پر نظموں کے تراجم ہوتے تھے ، پھر ٹیگور اور نذرالاسلام کے تراجم کا یقیناً اس زمانے کی تحریکوں سے بھی کوئی رشتہ تھا ۔ مضمون نگار کا احساس مغربی ادب سے ہونے والے تراجم کے بارے میں ہے تاہم اسے کلی سچائی نہیں سمجھنا چاہیے ۔ اس پس منظر میں یہ بات کچھ عجیب لگتی ہے کہ اب پچھلے کچھ برسوں سے فلسطین سے لے کر لاطینی امریکہ کی جدو جہد سے ترجمہ کرنے والوں نے جو رشتہ قائم کر رکھا ہے مضمون نگار اسے نظر انداز کر گئے ہیں ۔

۲ - اس مضمون کی فہرستیں ایک بار پھر اس چیز کا احساس دلاتی ہیں کہ اردو میں تراجم کا صرف تاریخی جائزہ مرتب کرنے کا مرحلہ بھی کتنا کٹھن ہے - وہ تراجم جو رسائل کے صفحات میں خوابیدہ ہیں انھیں ذہن میں رکھا جائے تو اس مشکل میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا - ہمارے رسائل کے اشاریے مرتب کرنے کی طرف ابھی بہت کم توجہ ہوئی ہے اگر تراجم کا کوئی جامع اشاریہ مرتب ہوسکے تو حقیقی معنوں میں اس شعبے کی وسعتوں کا اندازہ بھی ہو سکے گا - بہت سے اور بھولے بسرے مترجمین کی یاد بھی پھر سے تازہ ہو سکے گی - موجودہ صورت میں ہماری ہر فہرست چاہے وہ کتنی مشقت سے تیار کی گئی ہو نا مکمل ہی کہلائے گی -

۳ - میرزا حامد بیگ صاحب نے ان فہرستوں کی تیاری کے علاوہ دو اہم سوالات اٹھائے ہیں جن میں پہلا سوال ''مشرق اور مغرب'' کے تضاد سے تعلق رکھتا ہے ، انہوں نے کیمیا دانی اور کیمیا گری کے حوالے سے اس تضاد کو ظاہر کیا یہ وہ فکری مسئلہ ہے جس پر محمد حسن عسکری کی کتاب ''جدیدیت'' کے حوالے سے عجب عجب بحثیں ہو رہی ہیں - اس لیے ہم اس سوال کو بس چھوتے ہوئے ان کے اٹھائے ہوئے دوسرے سوال کی طرف چلتے ہیں جس کا براہ راست تراجم کی عملی صورت سے تعلق ہے ، حامد بیگ صاحب نے سب سے زیادہ برہمی کا اظہار ان تراجم کے سلسلے میں کیا ہے جن کے لیے وہ ''آزاد ترجمہ'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ، انھیں شکوہ ہے کہ ہمارے مترجمین نے مقامی ماحول کو غیر ملکی ماحول میں شامل کر دیا ہے ، یہ سوال آج کی بحث کا ایک بنیادی سوال بننا چاہیے - بات چونکہ ادبی تراجم کی ہو رہی ہے ، اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ ترجمے میں بعض وقت آزادی نئے تخلیقی امکانات کو پیدا کرتی ہے مضمون نگار نے اس چیز کا خیال نہیں کیا ، کہ اس سوال کی منفی جہت برحق مگر اس کی ایک مثبت جہت بھی ہے ، جس کا احاطہ کیے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی ، سرشار اور تیرتھ رام فیروز پوری کو ایک سطح پر رکھنے سے ان کی اس الجھن کا اندازہ ہو سکتا ہے ، سرشار کے ترجمے ''خدائی فوجدار'' نا کاق (یعنی ترجمے کی حد تک) اپنی جگہ لیکن اس کی کامیابی کو خراج تحسین عسکری صاحب نے اسی مضمون میں پیش کیا ہے ، جس پر زیر تبصرہ مضمون کی کئی باتوں

کی اساس ہے ، اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا ہوگا - تخلیقی فن کار جس طرح ایسے تراجم کے ذریعے نئے امکانات کو کھنگالتے ہیں وہ علیحدہ موضوع ہے اور شائد میرزا حامد بیگ بھی اُن سے اختلاف نہ رکھتے ہوں ، تاہم اس مضمون میں یہ حد بندی واضح نہیں - ایذراپاؤنڈ نے چینی نظموں کے جو تراجم کیے ان کی غلطیاں پروفیسر حضرات نے گنوا رکھی ہیں - حتیٰ کہ فینو لوسا کے مسودات جن پر پاؤنڈ کے بہت سے نظریات کا دار و مدار تھا - ان کے معیار کو بھی مشکوک قرار دیا جاتا ہے ، مگر پاؤنڈ کے ذریعے جو امکانات سامنے آئے ان کے سامنے پروفیسروں کا تمام علم حقیر ہی نظر آتا ہے - مغربی زبانوں میں بالعموم اہم اور مشہور کتابوں سے کئی کئی تراجم موجود ہیں جن میں لفظی تراجم بھی ہیں اور تخلیقی فن کاروں کے منفرد ترجمے بھی - اس لیے قاری مختلف طرح کے تراجم دیکھ سکتا ہے - اردو میں چونکہ ایک کتاب عام طور سے ایک بار ترجمہ ہوتی ہے اس لیے میرزا صاحب نے زیادہ برا منایا ، مگر کیا ہمارے لیے یہ سوال کچھ اہمیت نہیں رکھتا کہ سرشار نے انیسویں صدی میں سروانتیس کے اسلوب سے جو کشمکش کی ، اس طرح آج سو سال گزرنے کے بعد کوئی کیوں نہیں کر سکا - ایذراپاؤنڈ نے سو تو کلیز کے مشہور ڈرامے کا ترجمہ کیا ہے - اس ترجمے کو پاؤنڈ کے طریق کار کی انفرادیت کا مظہر قرار دیا گیا -

S.V. Jankowski نے اس ترجمے کا ایک تعارف لکھا ہے جن میں پاؤنڈ کے ترجمے کا تقابل پہلے کیے گئے تراجم سے کیا ہے صرف دو سطروں کے ترجموں کا تقابل دیکھتے چلیے -

ایف سٹور نے ان سطروں کا ترجمہ یوں کیا ہے :

Set on thy lips a curb of steel,
Thymouth let stony silence seal:

اور گلبرٹ مرے کا ترجمہ یوں ہے :

Set me a brake on stony lips , steel hard and true.

اب پاؤنڈ کی سطریں دیکھیے :

And Put some cement in your face, Reinforced concrete,....

شائد پاؤنڈ نے ہمیں یونان سے امریکہ پہنچا دیا مگر جالکوسی کے کے الفاظ میں جدید ذہن کو سخت چیز کا احساس دلانے کے لیے پاؤنڈ کی سطریں اپنے اندر ایسی بلاغت رکھتی ہیں جو لفظی ترجمے میں نہیں مل سکتی ۔

سرشار ہمیں سروانتیس نہیں پڑھا رہے تھے انیسویں صدی کے لکھنؤ کو پڑھا رہے تھے ۔

اس سرسری تجزیے سے اردو میں ادبی تراجم کے مسئلے کے کچھ پہلوؤں کی وضاحت بھی مقصود ہے اردو اس مضمون پر بحث کے دائرے کی حدود یقین کا بھی ایک مقصد ہے امید ہے یہ سوال آپ کی توجہ کا مستحق ٹھہریں گے ۔

گفتگو

ڈاکٹر ریاض مجید ، اعجاز راہی

مظفر علی سید کے مقالے اور پروفیسر رشید امجد کے تبصرے کے بعد صدر جلسہ نے عام بحث کی دعوت دی ۔

نظیر صدیقی :

مظفر علی سید صاحب کا مقالہ نہایت عالمانہ اور فاضلانہ ہے اور انہوں نے ترجمہ سے متعلق نہایت اہم پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ۔ ترجمہ کا فن ، اسلوب اور دوسرے عناصر پر بحث کے دوران انہوں نے نہایت اہم سوال بھی اٹھائے ہیں اور ان کا جواب دینے کی کوشش بھی کی ہے ۔

آج اردو زبان میں تراجم کے حوالے سے جو سیمینار منعقد ہو رہا ہے ، وہ یقیناً اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ترجمہ کے مسائل کو قومی سطح پر محسوس کیا جا رہا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں مقتدرہ نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اس پر سیمینار منعقد کرا کر قابل تحسین کام کیا ہے ۔

آج ترجمہ کے میدان میں کئی نئے سوال اٹھائے جا رہے ہیں ۔ لیکن میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور ایک زبان کو مکمل طور پر دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا ۔ خاص طور پر شعری ادب کو دوسری زبان کے شعری آہنگ میں منتقل کرنا مشکل ترین کام ہے ۔ جیسے اردو زبان کو ہی لیجیے ، اگر شعری حسن آہنگ کو محل نظر نہ بھی رکھا جائے ، تو بھی قافیہ ردیف کی پابندی اردو شاعری سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کو مکمل نہیں ہونے

دیتی ۔ میری رائے ہے کہ شاعری کا ترجمہ شاعری کی بجائے نثر میں کیا جانا چاہیے کہ ایک زبان کی شاعری کا مکمل نہ سہی کسی حد تک شاعرانہ آہنگ بھی منتقل کیا جا سکے ۔

مسکین حجازی :

میں ادب کے حوالے سے نہیں ، صحافت کی بات کروں گا ، صحافت میں ترجمہ ایک بالکل الگ کام ہے ۔ کیونکہ اس میدان میں دو بنیادی چیزیں ہوتی ہیں ۔

ایک خبر — دوسرا وقت ۔

اگر ترجمہ کرتے ہوئے خبر منتقل نہیں ہوتی ، تب بھی بات ادھوری رہ جاتی ہے اور اگر وقت پر خبر نہیں جا پاتی ، تو تب بھی ساری تگ و دو لاحاصل رہ جاتی ہے ۔ لہذا وقت اور خبر دو بنیادی عنصر کے طور پر ترجمے کے ساتھ رہتے ہیں ۔

ترجمے کے اصولی مباحث میں صحافتی ترجموں کو زیر بحث لانے کے لیے ہی دو مسائل سامنے آتے ہیں ۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے علاوہ بھی کئی عناصر ترجمے میں بنیادی کردار رکھتے ہیں ۔ جیسے دونوں زبانوں یعنی جہاں سے ترجمہ کیا جا رہا ہے ، جس میں ترجمہ ہو رہا ہے ، دونوں پر ایک حد تک مترجم کی گرفت ضروری ہے ۔ کیونکہ اگر مفہوم واضح نہیں ہوتا ، تو رائے عامہ خراب ہوتی ہے ۔ اس لیے دونوں زبانوں پر ایک حد تک دسترس ضروری ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم سوال وہ ہے جس کی طرف نظیر صدیقی نے اشارہ بھی کیا ہے کہ کیا ترجمہ میں پورا مفہوم اور روح منتقل ہو سکتی ہے ؟

نظیر صدیقی :

جناب ترجمہ کرتے ہوئے لفظوں اور روح کی منتقلی ہی کافی نہیں ہوتی ، کچھ اور عناصر بھی ہوتے ہیں ، ہر زبان کا اپنا آہنگ اور موسیقی ہوتی ہے ، نثر میں تو شاید یہ ممکن ہو ، ویسے مجھے تو اس میں بھی شک ہے ، لیکن کیا شاعری میں ایک زبان کے آہنگ اور موسیقی کو دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے ؟

مظفر علی سید :

جناب شاید مکمل منتقلی تو ممکن نہیں ، لیکن مماثلت ضرور پیدا کی جاسکتی ہے اور لوگوں نے اسے ممکن بنایا ہے ۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں :

مماثلت یا مماثل اثرات کی بات کی وضاحت میراجی نے خوب کی ہے ۔ ایڈگر ایلن پو کے ایک مصرعے کو اس کی موسیقیت اور آہنگ کے ساتھ منتقل کرنے کے لیے انھوں نے ایک ایسی بحر کی تلاش کی جس میں یہ ممکن تھا ، چنانچہ اس کے لیے انھوں نے میر کی ایک طویل بحر کا انتخاب کیا ۔ جس میں گیت کا آہنگ تھا اور میراجی اس میں کامیاب رہے ہیں ۔

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں :

ترجمہ کثیر المقاصد ہوتا ہے ۔ مجھے اس بات سے کلیتہ اتفاق ہے ۔ اول یہ کہ معانی منتقل ہو جائیں ، یہ ترجمے کا بنیادی کام ہے اس کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے ، جسے ہم دانشورانہ طور پر دیکھتے ہیں یعنی

اصل کا آہنگ ، فضا ، صوتی اثرات ، اور موسیقیت کی منتقلی ۔ یہ سب عناصر منتقل ہوں تو سہیل احمد خاں والی بات ایکن بنتی ہے ۔ لیکن حقی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اور ترجمے کی عملی اور نظری کوششیں کی ہیں ، مظفر علی سید نے حسن عسکری سے سند لا کر ان کی تردید کی کوشش کی ہے ۔ بہر حال یہ ترجمہ ہی ہے ، جس کی بدولت عمر خیام مغرب کی دنیا میں متعارف ہوا ۔

ترجمہ کی کئی سطحیں ہوتی ہیں اور ہر دور اپنے مخصوص مقاصد کے تحت ترجمہ کرتا ہے ۔ لیکن ترجمے کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ۔

مقالہ — جناب طارق محمود

تبصرہ — جناب ڈاکٹر اسلم فرخی

شان الحق حقی :

طارق محمود صاحب نے اپنے مقالے میں قابل لحاظ حد تک تراجم کے کام کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود کئی قابل ذکر ترجمہ شدہ کتابوں کا ذکر اس میں نہیں آیا جیسے مولوی کمال الدین

صاحب کے زیر نگرانی ۱۹۱۸ء یا ۱۹۲۰ء میں میڈیسن کی کتاب ترجمہ ہوئی تھی۔ اس طرح دوسری کتابوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

طارق محمود :

اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی قابل ذکر کتابیں رہ گئی ہیں۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ وہ میرے مطالعہ سے باہر تھیں وقت کی کمی اور مقالے کی طوالت کے سبب بہت سی چیزیں مجبوراً چھوڑنی پڑیں۔ جہاں تک رڑکی کی کتابوں کا تعلق ہے، میں نے انھیں کراچی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے وہ ترجمہ سے زیادہ طبع زاد تھیں۔

مرزا حامد بیگ :

مقالہ میں کئی اہم کتابوں کا ذکر نہیں آسکا مثلاً ٹامسن کی کتاب اور ماسکو کے وہ تراجم جن میں جامعہ عثمانیہ کے کام کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سائنٹیفک سوسائٹی غازی پور اور فرانسیسیوں اور پادریوں کا وہ کام جو اردو میں ترجمہ ہوا مقالے کے احاطے میں شامل نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی :

اب تک اردو زبان میں اس قدر تراجم ہو چکے ہیں کہ کسی ایک موضوع پر اگر کتابوں کی فہرست گنوائی جائے تو قطعی طور پر ایک مقالہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ جناب طارق محمود نے کوشش کی ہے کہ وہ تمام قابل ذکر کام جو ترجمہ کے ضمن میں قابل لحاظ ہے، وہ زیر بحث آئے اور ایک مضمون سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اس میں تمام کتابوں کا بالتفصیل ذکر ہو۔ اصل میں یہ مقالات بحث کے آغاز کے طور پر مختلف ادوار کے حوالے سے مختلف مسائل اور کام کو سامنے لاتے ہیں تاکہ ماضی کے کام کو سامنے رکھ کر مستقبل کے لیے امکانات کی تلاش کی جا سکے۔ اس لحاظ سے جناب طارق محمود کا مقالہ خاصی حد تک اپنا مقصد پورا کرتا ہے۔ ہمارے سامنے جو صورت حال آج موجود ہے وہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ بین الاقوامی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا جانا چاہیے اور اسے بعینہ قبول کر لیا جائے۔ جب کہ دوسرے طبقہ کا خیال ہے کہ ان کا ترجمہ ہونا چاہیے

ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ بااثر ہو لیکن ایسا ترجمہ بھی نہ کیا جائے کہ بات غیر مانوس ہو جائے۔

حکومت نے سائنسی علامات ترقیمات اور ہندسوں کے بارے میں ایک منصوبہ مقتدرہ کے سپرد کیا تھا اس ضمن میں ایک کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے اور اسے جلد پیش کر دیا جائے گا۔ لیکن ان اصطلاحات کے استعمال کا کام سائنسدانوں کا ہے کہ یہ بات ان کے سوچنے کی ہے کہ وہ بین الاقوامی اصطلاحات کا ترجمہ چاہتے ہیں یا اسے ویسے ہی استعمال کرنا چاہتے ہیں؟

طارق محمود :

ترجمہ اور خصوصاً اصطلاحات کا ترجمہ ایک مشکل کام ہے مثلاً آپ جرمن اور انگریزی کی مثال لیجیے جب جرمن اصطلاحات یا متن کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا وہ اصل سے بڑھ گیا اس لیے بعض چیزوں کی وضاحت کے لیے ترجمے کے وقت بعض اصطلاحیں محدود لفظیات میں پورے مفہوم کو واضح کرنے میں ناکام رہتی ہیں چنانچہ مجبوراً مفہوم کے اظہار کے لیے تشریحی زبان استعمال کرنا پڑتی ہے اور اصطلاح اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

شان الحق حقی :

اردو زبان کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ کو اپنے نظام اصوات میں ڈھال لیتی ہے اگر لفظ اردو زبان کے مکمل آہنگ میں نظر نہ آئے تو اجنبی نظر آتا ہے جہاں تک بین الاقوامی اصطلاحات کا تعلق ہے انھیں اردو میں اپنا لینے میں کوئی حرج نہیں اس سے یہ فائدہ بھی ہے کہ ایک Common Idiom بھی قائم ہو سکتا ہے جو سائنس اور دوسرے علوم میں یقیناً کار آمد ہو گا۔

رشید امجد :

جناب صدر یہ تو درست ہے کہ جناب طارق محمود نے اور جناب اسلم فرخی نے ماضی کے حوالے سے ترجمہ کی کوششوں کا بھر پور جائزہ لیا ہے، لیکن مقتدرہ کے لیے اہم کام یہ ہے کہ مستقبل کے لیے وہ کون سے طریقہ ہائے ترجمہ اختیار کیے جائیں جسے اختیار کر کے سائنسی و فنی علوم کے ترجمہ کے مسائل حل کیے جا سکیں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ

ہر وہ اصطلاح جس کے لیے انگریزی کے مترادف کے طور پر اردو میں بہتر ترجمہ کے امکانات ہیں ، اسے ترجمے کیا جانا چاہیے ، لیکن وہ اصطلاح جو اردو میں منتقل ہونے کے بعد زیادہ نامانوس ہو جائے اسے اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے ۔ اس لیے جہاں قومی زبان میں ترجمہ کرنا زبان کی وسعت پذیری کی ایک کوشش ہوگی وہیں اگر کوئی لفظ اردو میں اپنا لیا جائے اور وہ اردو کے مخصوص مزاج کے خلاف نہ ہو تو میرے نزدیک یہ بھی مستحسن ہوگا مقتدرہ قومی زبان نے جو کتب یا اصطلاحات کے ترجمے کیے ہیں وہ ایک بین بین رویے کی غمازی کرتے ہیں اور میرے نزدیک معقول رویہ یہی ہے ۔ جیسے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے فرمایا تھا کہ سائنس دانوں میں ایک طبقہ جو مکمل ترجمے کے حق میں ہے اور دوسرا بین الاقوامی اصطلاحات کو بعینہ قبول کرنے کا حامی ہے میرے نزدیک اس کا وہ تیسرا رویہ زیادہ معقول ہوگا جس کی طرف ابھی میں نے اشارہ کیا ہے جس کی رو سے غیر مانوس ترجمے سے بھی ہم بچ سکتے ہیں اور ان اصطلاحات کے لیے خوبصورت الفاظ کی تلاش بھی کر سکتے ہیں جن کا ترجمہ اردو کے بعد اجنبی محسوس ہوتا ہے ۔

آفتاب احمد خاں :

میرے خیال میں ابھی ایک مقالہ رہتا ہے اسے بھی پڑھ لیا جائے تو پھر ایک مجموعی گفتگو کرنا ہمارے لیے آسان ہو گا ۔

مقالہ — مرزا حامد بیگ

تبصرہ — ڈاکٹر سہیل احمد خاں

نظیر صدیقی :

مقالہ اور تبصرہ سننے کے بعد جو تاثر ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ترجمہ کی دو اقسام ہو سکتی ہیں ۔ ایک آزاد ترجمہ ، دوسرا Faithful ترجمہ — لیکن مقالے اور تبصرے سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ان دونوں میں کون سا طریقہ کار بہتر ہے ۔

آزاد ترجمہ میں ابہام کی صورت حال زیادہ گھمبیر نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی بات مکمل منتقل نہیں ہوتی اور جہاں بات مکمل ہوتی ہے ، وہ ترجمہ نہیں رہتا جیسے قرۃ العین حیدر کے کیے ہوئے ناولوں کے تراجم کو کیا ہم

ترجمہ ہی کہیں گے یا Re-Writing ؟ اور پھر یہ کہ یہ رویہ کہاں تک جائز ہے ؟

اردو میں اچھے برے بہت سے ترجمے ہوئے ، مگر یہ حقیقت ہے کہ ابتدا ہمیشہ ناکام کوششوں سے ہی ہوتی ہے ۔

دوسری بات ۔ انگریزی ۱ ۱/۲ سو برسوں تک حکمران رہی ہے، مگر ہم نے ترجمہ کرتے ہوئے انگریزی کے اول درجے کے ادب کو اردو میں منتقل نہیں کیا ۔

عربی فارسی سے ہمارا گہرا رشتہ رہا ہے ۔ تو کیا ہم نے عربی فارسی کے تمام کلاسیکل ادب کا اردو میں ترجمہ کر لیا ہے ؟ یقیناً ہمارا جواب نفی میں ہے ۔ ہمارا دامن ہنوز اعلیٰ ادبی تراجم سے تہی ہے ۔ چینیوں کی مثال لیجیے انھوں نے اپنے نظریات و افکار پر پوری طرح کاربند رہنے اور غیر ملکی نظریات و افکار کو چین میں داخل ہونے سے ہمیشہ روکے رکھنے کے باوجود اعلیٰ ادب کے لیے ان کے دروازے کبھی بند نہیں ہونے ۔ وہاں بیسویں صدی کے شاہکار ناول ترجمہ ہوتے ہیں اور عام چینی عوام تک پہنچے بھی ہیں ۔ مگر ہمارے ہاں ترجمہ کرنے والوں ، شائع کرنے والوں حوصلہ افزائی کرنے والوں اور پڑھنے والوں کی ہمیشہ کمی رہی ہے اس کام کو ایک منظم طریقے سے ہی آگے بڑھایا جا سکتا ہے ۔

شان الحق حقی :

مرزا حامد بیگ کی یہ بات درست نہیں کہ طباطبائی کی گور غریباں سے ترجمہ کی ابتدا ہوئی اس کا آغاز مرزا غالب سے ہوا تھا ۔

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں :

یہ درست ہے ، کہ ترجمے اور خصوصاً ادبی تراجم کسی منظم کوشش کا نتیجہ نہیں ہیں ۔ یہ ترجمہ کرنے والوں کے اپنے شوق یا تجارتی کمپنیوں کے مقاصد کے لیے ترجمہ ہوئے ، اس میں کسی کار خیر کا دخل نہیں تھا ۔ تعمیری یا علم کو پھیلانے کے مقاصد کے لیے جو تراجم کیے جاتے ہیں ، ان کے پیچھے منظم مہمات کام کرتی ہیں ۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ تیرتھ رام فیروز پوری ، ندیم صہبائی وغیرہ نے تجارتی مقاصد کے تحت ہی سہی ترجمے کی روایت بہرحال قائم کی ہے ۔ لیکن یہ بات قابل غور

رہنی چاہیے کہ ۱۹۵۷ء کے بعد جو نسل ادب میں آئی ہے وہ ترجموں کی مرہون منت نہیں تھی۔ اس نے انگریزی ادب کو براہ راست پڑھا ہے۔ گوئٹے، شیکسپیئر، کیٹس، شیلے وغیرہ سے وہ انگریزی میں ہی متعارف ہوئی۔ اب جو ترجمے ہوتے ہیں وہ ان ادیبوں کی اپنی پسند تک محدود ہیں۔

مظفر علی سید نے ایک بات بڑے پتے کی کہی ہے کہ ایک زمانے میں تراجم کے طفیل تہذیبوں میں تبدیلیاں رونما ہوتی تھیں۔ یونانی سے انگریزی میں ہونے والے تراجم وہاں کے معاشرے میں تبدیلی کا سبب بنے اور یونانی سے ہی عربی میں ہونے والے تراجم عربی نشاۃ ثانیہ بن کر آئے اور آج کی دنیا میں بھی تراجم اگر ایک منظم و مرتب انداز میں ہوں، تو سائنسی معلومات معاشرے کے درو بست میں تبدیلی کا سبب بن سکتی ہیں لیکن دوسری طرف سائنس جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس نے تیز تر ترجموں کی رفتار کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ چہ جائیکہ ابھی ہم ترجموں کا مسئلہ یا طریقہ کار طے کرنے پر سوچ رہے ہیں۔ سائنسی ترقیات علامات اور اصطلاحات اس تیزی سے علوم و فنون میں داخل ہو رہی ہیں کہ اب یہ مطالبہ پھر سے زور پکڑ رہا ہے کہ تعلیم انگریزی میں دی جائے۔

اگر ہم انگریزی اور اردو کا موازنہ کریں تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی کہ ان ۳۸/۳۵ سالوں میں انگریزی کو فروغ حاصل ہوا ہے اور اردو کے مقابلے میں انگریزی پھیلی ہے۔

اس رویے نے بھی ترجمہ کے کام میں دشواریاں پیدا کی ہیں۔ اب آئیے تراجم کی طرف—اردو سے انگریزی، انگریزی سے اردو میں جو بھی معیاری تراجم ہوئے، ان کی پذیرائی ہوئی ہے۔ نکلس نے جب اقبال کا ترجمہ کیا، تو ۱۹۲۰ء میں ہربرٹ ریڈ نے بے اختیار کہا تھا۔ کہ مشرق کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے شاعر کا موازنہ والٹ وٹ مین سے کیا جانا چاہیے جو پھول اور پتیوں کی باتیں کر رہا ہے۔ اسی طرح شیکسپیئر کے دو سو سے زائد ترجمے ہوئے۔ ان میں شان الحق حقی صاحب کا ترجمہ نہایت معیاری ہے اور یہ اردو کی ثروت (Richness) کو ظاہر کرتا ہے۔

اب رہی آزاد یا لفظی ترجمے کی بات—جدید ادب کا بہت سا حصہ آزاد ترجمہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

اقبال، فیض، راشد یہاں تک کہ آزاد کی نیرنگ خیال میں بھی آزاد ترجمے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

آفتاب احمد خان:

میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں مقتدرہ کو نہایت اہم سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے ۱۹۴۷ء سے اب تک بے شمار سیمیناروں میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے، مگر نہایت دیانتدارانہ بات ہے کہ سیمینار کی اس پہلی نشست میں جو مقالات تبصرے اور بحث سنی، معیار کے اعتبار سے مجھے وہ اب تک پہلے کہیں نظر نہیں آئی اور پھر یوں بھی یہ اجلاس میرے لیے باعث تکریم ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں ترجمے کے موضوع پر یہ پہلا سیمینار ہے۔

اس نشست میں نہایت عالمانہ، بے باکانہ اور صحت مند گفتگو ہوئی اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہم نے کلی سچائی کی طرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ ایسی نشستیں یقیناً ثمر بار رہتی ہیں اور اس کا معیار ہی اس سیمینار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ بہر طور میں صرف چند امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

(الف) مقتدرہ کے زیر اہتمام ایک شاندار قسم کا کتب خانہ قائم ہونا چاہیے جس میں اب تک ہونے والے تمام تراجم موجود ہوں۔ یہ کتب خانہ اپنی مثال آپ ہو۔

(ب) فنی، سائنسی اور سماجی علوم کی اصطلاح سازی اور معیار بندی کے کام کو تیز کیا جانا چاہیے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ پاکستان کے اکثر علمی اداروں نے اس پر صاد کیا ہے کہ معیار بندی کا کام مقتدرہ انجام دے، چنانچہ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ مقتدرہ اس کام کے لیے اہل ہے اور وہ بطریق احسن اس کام کو تیز رفتاری سے آگے بڑھائے گا۔

(ج) یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک کام کو بیک وقت کئی لوگ یا ادارے کر رہے ہیں اور ہونا چاہیے ، بہت سا کام ہونا چاہیے اس لیے کہ ہر دور کے کام میں سے صرف ، ۱۰ فیصد ہی باقی رہتا ہے ، ۹۰ فیصد غیر افادی حیثیت سے خود بخود ختم ہو جاتا ہے ۔ جو چیز مفید نہیں ہوگی ، وہ خود بخود ختم ہو جاتی ہے ۔

(د) ترجمہ ایک مشکل فن ہے آپ آزاد ترجمہ کریں یا پابند لفظی ایک زبان کو دوسری میں کلیتاً منتقل نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن اس کے قریب تر لے جانے کی کوشش کی جا سکتی ہے ۔ غالب کے تراجم ہوئے ، مگر اصل بات کہاں منتقل ہو سکتی ہے ۔

آپ فیض کی مثال لیجیے ۔ وہ اردو ، عربی ، فارسی اور انگریزی کے جید عالم تھے ۔ انھوں نے پیام مشرق کا ترجمہ کیا ہے ، وہ بات نہ بن سکی جو اصل کی ہے ۔ اسی طرح صوفی تبسم بہت بڑے جید لوگوں میں سے تھے ان کے تراجم قریب تر تو ہیں ، لیکن اصل روح کہاں قید ہو سکتی ہے ۔

لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں ، کہ ترجمہ ہونا ہی نہ چاہیے ، یہ تو ایک ایسا در ہے ، جو ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے ۔

خواتین و حضرات ! میں آخر میں ایک بار پھر آپ اور مقتدرہ کا شکرگزار ہوں ، جس نے اتنی عمدہ نشست میں شریک کرکے آپ لوگوں سے ملاقات کا موقع فراہم کیا ۔

دوسری نشست

علمی و فنی تراجم کے مسائل

rekhta

صدارت	ڈاکٹر رفیق احمد وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور
مہمان خصوصی	ڈاکٹر نذیر رومانی وائس چانسلر ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان
طبعی علوم کا ترجمہ ـ مسائل اور مشکلات	ڈاکٹر ظفر اقبال
تبصرہ	پروفیسر محمد انور بھٹی
سماجی علوم کا ترجمہ ـ مسائل اور مشکلات	بلال احمد زبیری
گفتگو (بحث دوسری نشست)	ڈاکٹر انور محمود خالد

طبعی علوم کا ترجمہ ـ مسائل اور مشکلات

پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال

لسانیات کے ماہرین اس بات سے متفق ہیں کہ کسی بھی موضوع کو مناسب طور پر سمجھنے کے لیے جو مؤثر کردار قومی زبان ادا کرسکتی ہے ـ اس کی توقع کسی غیر ملکی زبان سے نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے ہاں فنی و سائنسی موضوعات کی درس و تدریس میں انگریزی زبان کا دخل طویل عرصہ سے رہا ہے اور ایسے محسوس ہونے لگا ہے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ۔ دراصل ہم نے قومی زبان میں سائنسی علوم کو ڈھالنے کے لیے زیادہ جد و جہد کی ہی نہیں میرے علم میں ہے کہ مرکزی سائنس بورڈ اس سلسلے میں کوشاں ہے ـ مگر اس ادارے کے دائرہ اختیار میں ہر کام ممکن نہیں ـ اب اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان سائنسی و فنی علوم کو قومی زبان میں ڈھالنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ اس نیک کام میں ہمیں اس محاذ پر صف اول میں پائیں گے ـ

جب غیر ملکی زبان ذریعۂ تدریس بنتی ہے تو اصل موضوع کو سمجھنے کی بجائے طلبا کی ساری توجہ اور صلاحیتیں اس غیر ملکی زبان کو سمجھنے میں صرف ہو جاتی ہیں ـ چنانچہ طلبا سائنسی و فنی علم کی اصل روح تک نہیں پہنچ پاتے ـ ظاہر ہے غیر ملکی زبان پر سائنس کے طلباء کا اتنا عبور نہیں ہوسکتا جتنا کہ اپنی زبان پر ـ اس لیے غیر ملکی زبان میں تعلیم کو ذریعہ بنا کر طلبا سے ریسرچ اور گہری سوچ بچار کی توقع نہیں کی جا سکتی چنانچہ طلبا نفسِ مضمون سے اپنائیت پیدا نہیں کر سکتے اور اس کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے ، صرف سطحی حد تک علم حاصل کر سکتے ہیں ـ اس وقت کے پیش نظر وہ سائنس سے بیگانگی محسوس کرتے ہیں اور وہ ملک کی ترقی

میں بھرپور کردار ادا نہیں کر سکتے ۔ جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی ملک کے استحکام اور ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتی ہے ۔

اپنی قومی زبان کو مؤثر ذریعۂ تعلیم بنانے کی خاطر سائنس کے موضوعات کو اردو میں ڈھالنے اور پیش کرنے کا کام تیزی سے سرانجام دینا ایک قومی فریضہ ہے ۔ یہ کام اب اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ سائنس کے طلبا انگریزی میں مضمون کے اظہار میں الجھ کر رہ گئے ہیں مگر ایک بڑا مسئلہ جو درپیش ہے وہ یہ کہ سائنس کے علوم کا مواد اردو زبان میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ جبکہ سائنس کے علوم کو اردو میں ڈھالنا اشد ضروری ہے ۔ جب بھی ترقی یافتہ قوم سے علم کی شمع کو کسی اور قوم نے لیا اس میں پہلا مرحلہ کتب اور موضوعات کو اپنی زبان میں ڈھالنے کا کام تھا ۔ یونانی علم کو عرب سائنس دانوں نے عربی میں ڈھالنے کا کام کیا اور پھر مؤثر اور بھرپور انداز سے سائنس کے علوم کو عروج تک پہنچایا ۔ اسی طرح اہل یورپ نے مسلمان سائنس دانوں کے کام سے استفادہ کیا تو اپنی زبان میں علم کو سب سے پہلے ڈھالا اور پھر ترقی کی راہیں کھلتی گئیں ۔ ہمیں بھی یہ کام کرنا ہے مگر یہ کام آسان نہیں ۔ راہیں کٹھن سہی مگر ہم نے طے کرنی ہیں ۔ اس سلسلہ میں مقتدرہ قومی زبان بھرپور کردار ادا کر سکتا ہے ۔ خوشی کی بات ہے کہ مقتدرہ اس اہم اور زبردست کام کو آگے بڑھانے کی سعی کر رہا ہے ۔ جس کے لیے ہماری طرف سے مکمل تعاون رہے گا ۔

سائنسی اصلاحات کا مسئلہ آسان نہیں ۔ اس میں جتنی مشکلات درپیش ہیں ۔ اتنی ہی توجہ اور سنجیدگی سے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی ضرورت بھی ہے ۔ کوئی آٹھ دس سائنسی مضامین پر کتابیں اور مونو گراف لکھنے کا مجھے بھی موقع ملا ۔ آج کل بھی دو کتب سائنسی موضوعات پر چھپ رہی ہیں ۔ چنانچہ مشکلات کا احساس بھی ہوا اور ان کو حل کرنے کی تدابیر بھی اختیار کیں ۔ میری ناچیز رائے میں ، سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے میں درج ذیل مسائل اور مشکلات درپیش ہیں :

۱ ۔ معیاری سائنسی اصطلاحات کا فقدان ہے ۔ کوئی ایسی معیاری لغت نہیں جس کو معیار مان لیا جائے ۔ بعض اصطلاحات جو لغات میں نظر آتی ہیں ، الفاظ کی روح سے مناسبت نہیں رکھتیں ۔

۲ ۔ سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے کا کوئی مربوط پروگرام نہ ہونے کے سبب دلجمعی سے کام کرنا ممکن نہیں ۔

۳ ۔ لکھنے والوں کے لیے معقول معاوضہ یا ستائش کا فقدان ہے ۔ اس لیے اس میدان میں زیادہ اہل علم نہیں آتے ۔ کیونکہ یہ کام آسان نہیں ہے اور پھر اردو میں سائنسی مضامین پر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی ۔

۴ ۔ ابھی تک یہ نہیں طے پا سکا کہ انگریزی اصطلاحات کو ہر صورت بدلنا ہے یا ویسے ہی استعمال کر لینا مناسب ہے ۔ اس سلسلے میں اختلافات موجود ہیں اور دونوں نظریات رکھنے والی شخصیات نظر آتی ہیں ، جس سے مسئلہ الجھا ہوا ہے ۔

۵ ۔ سائنس کی اپنی کوئی زبان نہیں ۔ بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جا سکتا ہے ، مگر بعض ترجمہ نہیں ہو سکتیں ، مگر بعض مکتبہ فکر کے لوگ ہر لفظ کا ترجمہ ہی چاہتے ہیں اور اس ترجمے کو رائج کرنے کے فکر میں ہیں جو اس کام میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ۔

مذکورہ بالا مسائل اور مشکلات کو مدنظر رکھ کر میں چند تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں :

۱ ۔ سائنسی اصطلاحات میں ادب اور ادبی ذوق کا زیادہ عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ سائنسی اصطلاحات وضع کرتے وقت سائنسدانوں اور سائنس سے متعلق پروفیسر حضرات سے ، جو اس کام کا ذوق بھی رکھتے ہوں ، مشورہ اور رائے ضرور حاصل کرنی چاہیے ۔ اس سلسلے میں ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جا سکتی ہے ۔ جو اس کام کی نگرانی کرے اور کام کو آگے بڑھانے کے طریقے وضع کرے ۔

۲ ۔ سائنسی اصطلاحات سے انگریزی الفاظ کو ہر طریقے اور ہر لحاظ سے دوسری زبان میں ڈھال دینا مناسب نہیں ۔ چنانچہ (Atom) کو ایٹم کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ اس لیے بھی کہ اس لفظ کو ملک کا بچہ بچہ جانتا اور سمجھتا ہے ۔ اس کا ترجمہ

"جو ہر" کر دینے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ جو لفظ معاشرے میں رائج ہو جائے۔ اس کو رائج رہنے دینا ہی مناسب ہے ۔ جیسے سکول ۔ اسٹیشن ۔ ریڈیو ۔ ٹیلی ویژن وغیرہ ۔ اگر ہم ان کے تراجم کرنے بیٹھ گئے تو پھر ہماری کوئی منزل نہ ہوگی ۔ سائنس اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ ہم پیچھے ہی پیچھے رہتے چلے جائیں گے اور پتھر کے زمانے کے انسان معلوم ہوں گے ۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ انگریزی اصطلاحات جو قومی زبان اور معاشرے میں سما سکتی ہیں ، ان کو خوشی سے قبول کر لینا چاہیے ۔ ان کے متبادل اگر کوئی اچھی اصطلاح ہے تو وہ قوسین میں لکھ دی جانی چاہییں ، تاکہ اگر اس میں صلاحیت ہو تو وقت کے ساتھ ساتھ رائج ہو جائیں ۔

۳ ۔ معیاری اصطلاحات کا کام سرکاری طور پر شروع کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہر سائنسی مضامین کے لیے پروفیسران اور اہل علم حضرات کی کمیٹیاں تشکیل دی جائیں تاکہ وہ بنیادی کام کریں ۔ جس کے بعد یہ کام مضامین کے ماہرین کے سپرد کیا جائے لیکن سب سے پہلے ان کے سامنے چند اصول اور لائحہ عمل رکھنے ہوں گے ۔

۴ ۔ سائنس کو اردو میں لکھنے اور مضامین کو اردو میں ڈھالنے والوں کو خصوصی انعامات سے نوازنا اور ان کے کام کو سراہنا چاہیے اور اس کی مناسب تشہیر کی جانی چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ اہل علم حضرات اس کام کی طرف بڑھ سکیں ۔

۵ ۔ ایسے موضوعات جن پر پہلے کام کرنا ضروری ہے ، وہ مرکزی سطح پر مقتدرہ قومی زبان ترجیحی بنیادوں پر شروع کرائے تاکہ کسی منظم طریقہ سے کام کی ابتدا ہوسکے ۔

۶ ۔ اردو میں شائع شدہ سائنسی مواد کو ہر لائبریری میں بھیجنے کا انتظام کرنا چاہیے ۔ بلکہ ہر لائبریری میں ایسی کتب کا رکھنا لازمی قرار دیا جانا چاہیے ۔

یہ چند معروضات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا ، تاکہ طبعی علوم کے ترجمہ کے اصول طے کرتے ہوئے ، وہ مسائل اور مشکلات ہمارے سامنے رہیں ، جن کے حل کے بغیر ترجمہ کے بنیادی مقاصد حاصل کرنا ناممکن نہیں ، تو مشکل تر ضرور ہے ۔

طبعی علوم کا ترجمہ - مسائل اور مشکلات

پروفیسر محمد انور بھٹی

ڈاکٹر محمد ظفر اقبال صاحب کے مقالے کا عنوان ہے ''طبعی علوم کا ترجمہ، مسائل اور مشکلات'' - یہ مقالہ بہت اہم اور توجہ طلب ہے - اس میں متعدد تجاویز دی گئی ہیں جن پر فوری اور سنجیدہ غور کی ضرورت ہے'' -

پروفیسر صاحب اب تک اردو میں کیمیا کے مضمون میں متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں - اس کے علاوہ وہ اردو میں معیاری سائنسی اصطلاحات تیار کرنے کے اس کام میں بھی شریک رہے ہیں، جو گزشتہ چند سالوں میں ہوا ہے - پروفیسر صاحب سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کے زیر اہتمام قومی سائنس کانفرنسوں میں تقریباً ہر سال شرکت کرتے ہیں، چنانچہ اس میدان میں انہیں کافی علم اور تجربہ حاصل ہے اور انہیں ان مشکلات کا بھی اندازہ ہے جو طبیعی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں پیش آتی ہیں -

اس مقالے کے آغاز میں اس بنیادی اصول کو تسلیم کیا گیا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تدریس اور تحقیق کے لیے قومی زبان کو اختیار کرنا از بس ضروری ہے کیوں کہ کسی غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر نہ تو طلبا کو مؤثر طور پر سائنسی علوم پڑھائے جا سکتے ہیں، نہ ان سے ریسرچ اور گہری سوچ بچار کی توقع کی جا سکتی ہے - اس لیے مقالہ نگار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قومی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر سائنس کے موضوعات کو اردو میں ڈھالنے اور پیش کرنے کا کام تیزی سے سر انجام دینا ایک قومی فریضہ ہے - اس سلسلے میں مرکزی اردو سائنس بورڈ اور مقتدرہ قومی زبان کی کوششوں کا حوالہ دے کر یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ ان اداروں کو سائنسی اور فنی علوم کو اردو میں ڈھالنے کے کام میں لکھنے والوں کا بھرپور تعاون حاصل ہوگا -

یہ بات باعث اطمینان ہے کہ متذکرہ بالا رائے سے پاکستان کے بہت کم دانشوروں کو اختلاف ہے اور جو لوگ اس اصول کے مخالف ہیں ان کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے - یہ مخالفین اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ شاید اس ملک سے انگریزی زبان کو ختم کرنے کی تدابیر کی جا رہی ہیں جس کے بعد ہمارے طلبا اور نئے پیدا ہونے والے سائنسدان اس عظیم علمی خزانے سے استفادہ کرنے کے قابل نہ رہیں گے جو انگریزی سائنسی لڑیچر کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے یا آئندہ دستیاب ہوگا - حقیقت یہ ہے کہ قومی زبان کے حق میں بات کرنے والے تمام اہل علم اور سائنس دان حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ انگریزی زبان کی تدریس ہر حالت میں جاری رہنی چاہیے-

زیر نظر مقالے میں جن مشکلات کی نشان دہی کی گئی ہے ان میں سرفہرست اس مسئلے کو رکھا گیا ہے کہ اردو زبان میں معیاری اصطلاحات کا فقدان ہے - مقالہ نگار نے سائنسی اصطلاحات کے سلسلے میں دو متضاد مکتبہ ہائے فکر کا ذکر کیا ہے اول جو انگریزی اصطلاحات کو جوں کا توں رکھنے کا حامی ہے - دوسرے مکتبۂ فکر کے لوگ ہر اصطلاح کا اردو میں ترجمہ کرنے پر اصرار کرتے ہیں -

میری ناچیز رائے میں گزشتہ پندرہ بیس سالوں کے دوران اصطلاح سازی کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے اس کو اگر سامنے رکھا جائے تو دونوں مکتبہ ہائے فکر یا انتہاؤں کے درمیان پایا جانے والا اختلاف پہلے سے کم نظر آتا ہے یا پھر یوں کہیے کہ ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا مکتبۂ فکر پیدا ہو چکا ہے جو اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ تمام انگریزی اصطلاحات کو اردو میں بدل دینا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی مفید - بلکہ ایسے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات جو اب زبان زد عام ہیں انہیں اسی شکل میں برقرار رکھا جائے - اخبار اردو[۱] جلد ۲ شمارہ ۱۰ ماہ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں ایک مفید اور فکر انگیز مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے'' کراچی یونیورسٹی اور اصلاح سازی کے اصول'' اس مضمون کے مصنف جناب میجر (ریٹائرڈ) آفتاب حسن ہیں جن کا تعلق کراچی یونیورسٹی

---

۱ - مقتدرہ کا ماہنامہ جریدہ

rekhta

سے رہا ہے۔ موصوف اور ان کے ہم عصر اصحاب کو دانشوروں کے اس گروہ میں شمار کیا جاتا ہے جو ہر انگریزی اصطلاح کو اردو میں ترجمہ کرنے پر بضد ہیں۔ مگر اس مضمون کے مطالعے سے قدرے مختلف صورت حال سامنے آتی ہے جناب میجر صاحب نے اردو میں اصطلاح سازی کے جو اصول بیان کیے ہیں، ان میں اہم ترین یہ ہے کہ بین الاقوامی اصطلاحات کا یعنی ان اصطلاحات کا جو دنیا کی تمام زبانوں میں بجنسہٖ استعمال ہو رہی ہیں ترجمہ نہ کیا جائے۔ اسی اصول کے تحت یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ کیمیا میں عناصر کے لیے انگریزی علامات برقرار رکھی جائیں اور کیمیاوی مرکبات کے انگریزی نام بھی جوں کے توں رکھے جائیں۔ حیوانیات میں Order Genus اور Species کے لاطینی ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً عام مکھی کے لیے مسکا ڈومسٹیکا (Musca Domestica) گلاب کے لیے روزا انڈیکا (Rosa Indica) ہی لکھا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اشیا اور ادویات کے ناموں کا ترجمہ ضروری نہیں۔ تاہم اس مضمون میں اس امر کی صراحت بھی کی گئی ہے کہ ہر انگریزی اصطلاح بین الاقوامی اصطلاح نہیں، کیوں کہ دنیا کی دوسری قابل ذکر زبانوں میں ان کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں وہ املا کے لحاظ سے اور صوتی اعتبار سے مختلف ہیں۔

چند سال پہلے وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک استعمال ہونے والی معیاری سائنسی اصطلاحات مرتب کرنے کا کام شروع کرایا تھا، جس کے لیے پورے ملک سے متعدد سائنسدانوں اور لسانیات کے بعض ماہرین کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان میں فاضل مقالہ نگار بھی شامل تھے۔ بالآخر مقتدرہ قومی زبان کے تعاون سے معیاری اصطلاحات کی ایک مختصر لغت کی تسویدی اشاعت یعنی ڈرافٹ ایڈیشن اسی سال تیار کیا جا چکا ہے مگر اس میں طباعت کی بہت زیادہ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ امید ہے کہ باقاعدہ اشاعت کے دوران ان غلطیوں کو دور کر دیا جائے گا اور یہ معیاری لغت مجوزہ سطح تک کی درسی کتابوں کی تیاری میں استعمال کی جائے گی۔

پروفیسر ظفر اقبال صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابھی تک یہ طے نہیں پا سکا کہ انگریزی اصطلاحات کو ہر صورت بدلنا ہے یا ویسے ہی استعمال کر لینا مناسب ہے۔ یہاں میں ان سے تھوڑا سا اختلاف کرنا

چاہوں گا۔ یہ اصول کہ بین الاقوامی اصطلاحات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ نہ کیا جائے، کیمیائی مرکبات کے نام جوں کے توں رکھے جائیں وعلیٰ ہذالقیاس موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس اصول سے انحراف نہ کیا جائے۔

فاضل مقالہ نگار نے تجویز پیش کی ہے کہ جو انگریزی الفاظ اصطلاحات کے طور پر عوام میں رائج ہو چکے ہیں، جیسے کہ ایٹم، انھیں ویسے ہی برقرار رکھا جائے۔ یہ نہایت مناسب تجویز ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم اس امر میں احتیاط برتنی چاہیے کہ کون سی انگریزی اصطلاحات فی الحقیقت مقبول ہو چکی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس اصول کے بے محابا استعمال کے نتیجے میں ہم تمام انگریزی اصطلاحات کو اردو حروف میں لکھنا شروع کر دیں۔ بے شمار اصطلاحات ایسی ہیں جو ذرا نچلی سطح پر اردو میں رائج ہیں مگر اوپر کی سطح پر انگریزی میں۔ مثلاً ہائی سکول کا طالب علم ضیائی تالیف کی اردو اصطلاح کو سمجھتا اور بولتا ہے مگر آگے چل کر اس کے لیے Photo. Synthesis کی انگریزی اصلاح آ جاتی ہے۔ طالب علم کے ذہن اور یادداشت سے پہلی اصطلاح نکال کر دوسری اصطلاح کو داخل کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہم کس کو اختیار کریں گے۔

پروفیسر ظفر اقبال صاحب کی یہ تجویز فوری توجہ کی طالب ہے کہ معیاری اصطلاحات کا کام سرکاری طور پر شروع کر دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں جو کام محدود پیمانے پر ہو چکا ہے اسے بلاتاخیر آگے بڑھانا اور پایۂ تکمیل کو پہنچانا ضروری ہے۔ اس اہم کام کے لیے مقتدرہ قومی زبان مناسب ترین ادارہ ہے، اسے چاہیے کہ وہ سائنس کے ماہر اساتذہ اور پروفیسر حضرات کے تعاون سے یہ کام شروع کر دے۔ اس سلسلے میں ایک ابتدائی تحقیقی کام یہ ہونا چاہیے کہ سائنس کے مختلف شعبوں کے ماہرین ان انگریزی اصطلاحات کو الگ کرلیں جن کی حیثیت واقعتاً بین الاقوامی ہے۔

سائنس کی درسی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں ٹیکسٹ بک بورڈوں کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ اس وقت میٹرک تک کی تقریباً تمام کتابیں اردو میں دستیاب ہیں۔ انگریزی سکولوں کے لیے محدود تعداد میں ان

کتابوں کے انگریزی ایڈیشن شائع کیے جاتے ہیں مگر یہ سلسلہ آئندہ چند سالوں تک ختم کر دیا جائے گا اور تمام کتابیں صرف اردو میں شائع ہوں گی۔ لیکن اصل کام کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو میں درسی کتابیں لکھنے کا ہے۔ یہ اس قدر بڑا اور کٹھن کام ہے کہ اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے جس قدر اساتذہ، مصنفین اور مترجمین شریک ہو جائیں تھوڑے ہیں۔ چنانچہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی ان تجاویز سے اتفاق ہے کہ:

۱۔ یہ کام عنوانات کی ترجیحات مقرر کرنے کے بعد مرحلہ وار اور منظم طریقے سے کرانا ضروری ہے۔ مختلف عنوانات کو متعلقہ مضمون کے ماہر اور تجربہ کار اساتذہ کے سپرد کیا جائے اور کتاب کو مکمل کرنے کے لیے ایک مناسب ہدف اور مدت مقرر کی جائے۔

۲۔ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور معیاری کتابوں کے مصنفین کو معقول معاوضہ بطور انعام پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں میری اس تجویز پر بھی غور کیا جائے کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے عہدہ میں ترقی کے لیے جو شرائط مقرر ہیں ان میں تحقیقی مقالوں کی اشاعت کے علاوہ معیاری کتاب لکھنے یا ترجمہ کرنے کو بھی اہمیت دی جائے۔

سماجی علوم کا ترجمہ مسائل اور مشکلات

ہلال احمد زبیری

ترجمے کی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو سلیس، رواں اور آزاد ہوتا ہے دوسرا وہ جسے لفظی ترجمہ کہتے ہیں لوگ عام طور پر پہلی قسم کو پسند کرتے ہیں اور دوسری قسم کو ثقیل کہہ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ داستانوں، افسانوں، کہانیوں، مزاحیہ خاکوں اور ہلکی پھلکی نگارشات کے ترجمے کے لیے تو پہلی قسم بہت موزوں ہوتی ہے، مگر علوم و فنون کے ترجمہ میں دوسری قسم کو اختیار کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ یہاں تو اصل کے ہر لفظ کے معنی اور اس کی اہمیت ترجمہ میں حتی الامکان پوری طرح منعکس ہونی چاہیے، ورنہ مصنف نے دلائل و شواہد پیش کرکے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور ان کے اظہار و بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے ترجمہ ان کا آئینہ دار نہیں ہوگا۔ علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے والے مترجم پر بڑی سنگین ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے فکر کو اصل مصنف کے فکری قالب میں ڈھال کر ہی اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ علوم کا ترجمہ ہر صورت میں لفظی ہونا چاہیے۔

ترجمے کی مذکورہ بالا دو قسموں کی طرح ہم علوم کو بھی دو قسموں میں منقسم کرتے ہیں: سائنسی علوم اور سماجی علوم کے ترجمے کا انحصار زیادہ تر اصطلاحات پر ہوتا ہے۔ اگر کسی سائنسی علم کی تمام اصطلاحات مترجم کی میز پر رکھی ہوں تو ترجمہ میں زیادہ دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ آسان اور سادہ الفاظ کے ساتھ اصطلاحیں استعمال کرکے مطلب ادا کیا جا سکتا ہے۔ مگر سماجی علوم کے لیے اصطلاحات کے

rekhta

علاوہ دونوں زبانوں میں عام مہارت بھی ضروری ہوتی ہے اس پرزور اسی لیے دیا جاتا ہے کہ ان علوم کا ترجمہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ مترجم اصل زبان کو اچھی طرح نہ سمجھتا ہو اور اپنی زبان کے معنی خیز الفاظ کا کافی ذخیرہ اس کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ ہم جب ترجمہ کے مسائل پر بحث کرتے ہیں تو ہماری مراد عموماً انگریزی سے اردو ترجمہ سے ہوتی ہے اس لیے ترجمہ کی ان زبانوں پر عبور کے مسئلہ پر بحث کا آغاز ہم پہلے انگریزی سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد اردو کی قابلیت کا جائزہ لیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی زبان سے ہمارا واسطہ تقریباً دو سو سال کا ہے اور اس طویل عرصے میں ہماری کئی نسلیں انگریزی زبان کی تعلیم اے۔ بی۔ سی، ڈی سے لے کر یونیورسٹیوں کے اعلیٰ درجوں تک حاصل کرتی چلی آ رہی ہیں۔ ہم میں سے بہت جدید تعلیم یافتہ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ انگریزی زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور بعض تو یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ انھیں انگریزی زبان انگریزوں سے زیادہ آتی ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مترجم کسی ایسی زبان پر جو اس کے اپنے ملکی ماحول اور معاشرہ میں اجنبی ہو وہ عبور حاصل نہیں کر سکتا جو ان لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے جن کی وہ زبان ہے۔ انگریزی سے اردو میں ترجموں کے لیے اگر ایک پاکستانی مترجم میں انگریزی کی استعداد ایک معقول حد تک موجود ہو تو اسے کافی سمجھنا چاہیے۔ البتہ اس سلسلے میں یہ دیکھ لینا ضروری ہوگا کہ انگریزی زبان کی مطلوبہ استعداد صرف انگریزی ادب تک محدود نہ ہو بلکہ اس زبان میں کسی علم کی تحصیل کا موقع بھی حاصل ہوا ہو۔ زیادہ محفوظ اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ اس اس کا اطمینان کرلیا جائے کہ جس علم کا ترجمہ کرانا مقصود ہے اس میں مترجم کم سے کم ایم۔ اے کی سند حاصل کر چکا ہے اور اس علم کے مسائل پر بحث و تمحیص کا تجربہ رکھتا ہے۔ سماجی علوم کے ترجمہ کے لیے انگریزی زبان میں اعلیٰ قابلیت کا اطمینان حاصل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی ایسی علمی کتابیں بھی موجود ہیں جنھیں اگر آپ بعض مقامات پر اصل سے ملا کر دیکھیں تو انگریزی کا مطلب نہ سمجھنے کے باعث آپ کو ان میں "تفاوت رہ از کجاست تا بکجا" کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ اس قسم کی مثالیں

یہاں بھی پیش کی جا سکتی ہیں مگر میں کسی تعین کے ساتھ اس طرح کی عیب جوئی سے گریز کرتا ہوں اور صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میرے اس بیان کی تصدیق بہت سے ایسے اساتذہ اور طلبہ کریں گے جنھیں درس و تدریس کے دوران اس قسم کی مثالیں دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوا ہوگا۔

اپنی زبان اردو کے متعلق بھی کسی فرد کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کی مادری زبان یا قومی زبان ہے اس لیے وہ کسی علمی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بآسانی کر سکتا ہے۔ سماجی علوم کا ترجمہ کرنے کے لیے اسے اپنی زبان میں بھی اظہار و بیان کی پوری قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ انگریزی کے الفاظ، محاوروں اور اسالیب بیان کو سمجھ لینے کے بعد انھیں اپنی زبان میں اسی وقت صحت کے ساتھ ڈھالا جا سکتا ہے جب کہ مترجم کے پاس مناسب و موزوں الفاظ کا ذخیرہ موجود ہو۔ علمی اصطلاحات اور مشکل الفاظ کے لیے فرہنگوں، قاموسوں اور لغات کو بار بار دیکھنا تو بہر حال پڑے گا مگر مترجم کا خود اپنا ذخیرۂ الفاظ اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ اس کام پر حد سے زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے اور ایک معقول رفتار کے ساتھ کام آگے بڑھ سکے۔ جن لوگوں نے ان علوم کے ترجمے جامعۂ عثمانیہ کے زمانے میں کیے وہ غیر معمولی قابلیت کے انشا پرداز تھے۔ ان کی اعلیٰ اردو تعلیم کا پس منظر عربی اور فارسی کے گہرے روایتی مطالعہ پر مبنی تھا اور وہ ادائے مطالب پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کے تراجم کسی قدر دقیق تو ضرور ہیں کیونکہ اس زمانے میں عربی و فارسی کا رواج زیادہ تھا۔ مگر انھوں نے ادائے مطالب میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ انھیں اپنی زبان پر بھر پور اعتماد تھا اور وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے۔ سماجی علوم کے ترجمے کا عزم کرنے سے قبل مترجم صاحبان کو اپنے قدیم پیشروؤں کے علمی تراجم کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہیے۔ جو ادارے سماجی علوم کے ترجمے کا کام جاری کرنا چاہتے ہیں انھیں دہلی کالج اور جامعۂ عثمانیہ کے ان کلاسیکی تراجم کی فوٹو اسٹیٹ نقول انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص سے حاصل کرکے اپنی لائبریریوں میں رکھنی چاہییں اور مترجموں کو مطالعہ کے لیے عاریتہ دینی چاہییں۔ اس طرح مترجم اپنے فرض کو بآسانی انجام دے سکیں

گے - جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں محض اصطلاحات کی مدد سے کسی سائنسی علم کی کتاب کا ترجمہ بآسانی ہو سکتا ہے سماجی علوم کے لیے لسانی قابلیت ، وسیع مطالعہ اور محنت تینوں چیزیں لازمی ہیں -

مثال کے طور پر فلسفہ کی کسی کتاب کو لے لیجیے - اس میں اصطلاحات کی دستیابی ہی پر دار و مدار نہیں ہوتا - اصل مشکل کتاب کے پورے متن کو اردو میں منتقل کرتے وقت جا بجا اصل زبان کی تعبیرات ، توضیحات اور منطقی دلائل و براہین کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے میں پیش آتی ہے - فلسفہ کی ایک کتاب کے اردو ترجمہ پر دیباچہ لکھتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کے ایک صدر شعبۂ فلسفہ ، جو خود بھی اردو زبان میں اظہار و بیان کی غیر معمولی قابلیت رکھتے ہیں ، بڑے شدید احساس ذمداری کے ساتھ فرماتے ہیں :

"ترجمہ کا کام یوں بھی بہت کٹھن اور دشوار گزار ہے مگر فلسفہ کی کتاب کا ترجمہ تو بڑے جان جوکھوں کا کام ہے"۔[1]

ایک ایسے پروفیسر نے جو فلسفہ کے مضامین کا اردو ترجمہ کرنے کی پوری قابلیت رکھتا ہے اس کام کو "جان جوکھوں کا کام" اسی لیے کہا ہے کہ اس میں مترجم کو اپنی جان لڑانی پڑتی ہے دقیق فلسفیانہ مطالب کو ان کی تمام خصوصیات کے ساتھ اپنی زبان میں ادا کرنا پڑتا ہے - پھر خود فلسفہ کے علاوہ دوسرے سماجی علوم میں بھی پس منظر کے اندر ایک نہ ایک قسم کا فلسفہ برابر کار فرما رہتا ہے - تاریخ ، نفسیات ، اخلاقیات ، عمرانیات ، معاشیات ، غرض جملہ انسانی علوم جو انسان کے ذہن اور اس کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مسائل کا تجزیہ کسی نہ کسی قسم کے فلسفہ کا ضرور حامل ہوتا ہے - اس لیے سماجی علوم کے ترجمہ میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے سائنسی علوم کی طرح صرف اصطلاحیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں بلکہ ہر عبارت کی مترادف عبارت اپنی زبان میں پیش کرنے کے لیے ایک ایک لفظ کا مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے -

سماجی علوم کا ترجمہ پوری صحت اور قطعیت کے ساتھ کرنے کے لیے ایک شدید ضرورت درپیش ہے جسے حکومت کی فراخ دلانہ امداد

ہی پورا کرسکتی ہے - میری مراد ایک جامع انگریزی اردو ڈکشنری سے ہے - مولوی عبدالحق مرحوم نے سنہ ١٩٣٧ء میں ایک ایسی ڈکشنری مرتب کی تھی جسے انجمن ترقی اردو نے The Standard English Urdu Dictionary کے نام سے شائع کیا تھا" - اس کے بعد ایک مدت دراز تک اس کا کوئی دوسراایڈیشن شائع نہیں ہو سکا اور وہ بہت عرصہ تک نایاب رہی - انجمن نے اس پر نظر ثانی کا منصوبہ کئی بار بنایا مگر وہ بروئے کار نہ آسکا - بالآخرسنہ ١٩٦٨ء میں اس کی اشاعت ثانی محض فوٹو اسٹیٹ نقل کے ذریعہ طبع ہو سکی - مشمولات میں صرف معمولی سا فرق کیا گیا - کوئی ایسا کام نہیں ہو سکا جو اس لغت کی بنیادی کوتاہیوں کو دور کر سکتا یا اس خلیج کو پر کر سکتا جو ان دونوں اشاعتوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی - جناب جمیل الدین عالی صاحب نے جو اس وقت انجمن کے معتمد تھے ، اس اشاعت ثانی پر "چند باتیں" بطور دیباچہ لکھیں ، جس میں انجمن کی مجبوریوں ، وسائل کی کمی اور اصل منصوبہ کی بے پناہ وسعتوں اور دشواریوں کا ذکر تھا - ان گذارشات احوال واقعی سے جناب معتمد نے اپنا فریضہ تو ادا کر دیا مگر ان مترجموں کو سخت مایوسی ہوئی جو اس لغت میں بکثرت نئے الفاظ اور مخصوص معلوماتی ضمیموں کے اضافے کی توقع رکھتے تھے - اس لغت کی پہلی اشاعت اور اس کے عکس پر دوسری اشاعت اپنی طباعت کے لحاظ سے غنیمت ہے - مگر اس کا کاغذ اور اس کی جلد بندی نہایت تکلیف دہ ہے - پہلی اشاعت کے لیے بڑی کوشش اور جستجو سے بائبل پیپر حاصل کیا گیا تھا تاکہ کتاب کی ضخامت بہت زیادہ نہ بڑھنے پائے اور ایک ہی جلد میں تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات بآسانی سما جائیں دوسری اشاعت کے لیے بھی بائبل پیپر بڑی سفارش اور جدوجہد کے بعد حاصل کیا گیا اور اسی پر یہ اشاعت طبع کی گئی - نتیجہ یہ ہوا کہ جو تکلیف پہلے تھی وہی اب بھی جاری رہی - یہ کاغذ بار بار کی ورق گردانی اور کثرت استعمال سے سکڑنے ، مڑنے اور لپٹنے لگتا ہے پنکھے کے نیچے یا سامنے تو آپ پیپر ویٹوں یا کلپوں کے بغیر اس لغت سے کام لے ہی نہیں سکتے - اس کے ہوائی ورق ذرا سی ہوا ہو تو اڑنے لگتے ہیں - اس لغت کی جلد اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ نئی کتاب خریدنے کے تھوڑے دن بعد ہی ٹوٹنے لگتی ہے اور پھر سنبھالے نہیں سنبھلتی - میں اس لغت کا ذکر تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ اس لیے کررہا

ہوں کہ یہ واضح ہو جائے کہ ان تمام ظاہری نقائص اور باطنی کوتاہیوں کے باوجود اردو زبان کے مترجمین اس لغت کو اپنے سینے سے اس لیے لگائے ہوئے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی معیاری انگریزی اردو لغت موجود ہی نہیں ہے جس سے وہ استفادہ کر سکیں - ترجمہ کے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس لغت پر نظر ثانی کرکے اسے مترجمین کے لیے ایک جامع اردو انگریزی لغت بنایا جائے۔

یہ نہایت ضروری کام مقتدرہ قومی زبان یا خود انجمن ترقی اردو (دونوں میں سے جسے استطاعت حاصل ہو) کو پورے انہاک کے ساتھ انجام دینا چاہیے - پوری لغت کو از سر نو مرتب کیا جائے اور انگریزی کی ''کنسائز ڈکشنری'' کو سامنے رکھ کر کم سے کم پندرہ ہزار نئے الفاظ اور محاوروں کا اضافہ فوری طور پر کیا جائے موجودہ الفاظ میں سے جن الفاظ کے ساتھ مشہور محاورے نہیں دیے گئے ہیں ان کے ساتھ ایسے محاورے دیے جائیں اور جدید الفاظ کے ساتھ بھی یہ التزام قائم رکھا جائے۔ مترجمین کو ترجمے کے دوران جو اہم ضرورتیں پیش آتی ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس لغت میں انگریزی کی معیاری لغتوں کی طرح چند معلوماتی ضمیمے ضرور شامل کیے جائیں - مثلاً ایک ضمیمہ ان اہم شخصیتوں کے ناموں پر مشتمل ہونا چاہیے جن کا ذکر اکثر علمی کتابوں اور تاریخی تذکروں میں جابجا آتا ہے - ہر انگریزی نام کے سامنے اس کا اردو املا عربی حروف میں اعراب کے ساتھ درج ہونا چاہیے تاکہ ان ناموں کا تلفظ متعین ہو سکے دوسرا ضمیمہ اسی طرح تمام دنیا کے مقامات کے ناموں پر مشتمل ہونا چاہیے - اہم شخصیتوں اور مقامات کے نام جب اردو ترجمے میں اس طرح لکھے جائیں گے کہ ان کا تلفظ صاف ظاہر ہو تو پھر ان کے قوسین میں انگریزی حروف دہرانے کی ضرورت شاذ و نادر ہی پیش آئے گی - جامعہ عثمانیہ کی کتابوں میں شخصیتوں کے نام اسی طرح درج ہیں ہمیں اپنی زبان کے وقار کو ترجموں میں قائم رکھنا چاہیے اور ہر صفحہ پر جا بجا اشخاص ، مقامات اور اصطلاحات کو انگریزی میں بھی لکھ کر عبارت کی روانی اور صفحہ کی یکسانیت کو مجروح نہیں کرنا چاہیے کبھی کسی انگریزی کی کتاب میں ہماری شخصیتوں یا مقامات کے ناموں کے ساتھ ہمارے حروف میں ان

شخصیتوں یا مقامات کو دوبارہ درج نہیں کیا جاتا - اگر ہماری جامع ڈکشنری میں اہم شخصیتوں اور مقامات کے نام صحیح تلفظ کے ساتھ مل جائیں گے تو پھر ان کو ترجمہ میں بآسانی درج کیا جا سکے گا - ایک اور ضمیمہ مخففات یا مختصرات کا بھی ہونا چاہیے ۔ مخففات کا جو ضمیمہ اس ڈکشنری میں پہلے سے ہے وہ بالکل صحیح انداز پر نہیں ہے - ہر مخفف یا مختصر کے سامنے اس کا مطلب انگریزی ہی میں لکھ دیا گیا ہے اردو میں اس کے معنی درج نہیں ہیں - ہم چاہتے ہیں کہ اردو معنی بھی ضرور درج ہونے چاہییں ہماری خواہش یہ بھی ہے کہ اس ڈکشنری میں ایک ضمیمہ تلمیحات کے متعلق بھی ہو ۔ انگریزی زبان کی علمی کتابوں میں بعض اوقات ایسی تلمیحات آجاتی ہیں کہ ان کی گتھی کو سلجھائے بغیر سلسلہ آگے نہیں بڑھتا - ایسے موقعوں پر ہمارے مترجم کو کبھی انسائیکلوپیڈیا کی تلاش اور اس کی ورق گردانی سے بچانے کے لیے اپنی اس ڈکشنری ہی میں ایسی تلمیح کا مختصر حوالہ مل جانا چاہیے - اس طرح مترجم کا بہت سا وقت اور محنت بچ سکتی ہے - اس انداز پر نئے اضافوں کے ساتھ مرتب کی گئی ایک جامع لغت علوم و فنون کا ترجمہ کرنے والے مترجموں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی اور اس کی وجہ سے ترجموں کی رفتار اور تعداد میں یقیناً اضافہ ہو سکے گا - اس نئی اشاعت میں بائبل پیپر لگانے کے بجائے کوئی اور موزوں کاغذ لگانا چاہیے اور نئے اضافوں اور کاغذ کی تبدیلی کے باعث حجم میں اگر اضافہ ہو جائے تو دو یا تین جلدیں کر دینے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے اور جلد بندی کا بہتر اہتمام ہونا چاہیے - اس قسم کی لغت کے لیے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ سائنسی اور سماجی علوم کی جس قدر اصطلاحات اب تک وضع ہو چکی ہیں انہیں اس لغت میں اپنی اپنی جگہ ضم کر دیا جائے - مگر میں موجودہ مرحلہ پر اس قسم کی تجویز پیش نہیں کر سکتا آگے چل کر اصطلاحات کے مسئلہ پر بحث کے دوران اس بارے میں بھی کچھ عرض کروں گا -

ترجمے پر بحث کے سلسلہ میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے میں اس کے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں - ہر علم کی اصطلاحات کے کافی ذخیرے ہمارے پاس موجود ہیں - اردو میں

rekhta

اصطلاح سازی کا کام تقریباً ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے - ترجموں کا سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی زمانے ہی سے شروع ہو گیا تھا - جب کمپنی کی حکومت نے عدالتوں کی فارسی زبان کو بدل کر اس کی جگہ اردو کو رائج کیا ہے تو ان قوانین کو جو انگریزی میں وضع کیے گئے تھے اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی - اس وقت مقامی باشندوں کے ساتھ ساتھ بعض انگریز افسروں نے بھی قوانین کے اردو ترجموں میں حصہ لیا تھا۲ - جو قانونی اصطلاحات فارسی کے عدالتی زبان ہونے کے دوران مروج تھیں انھیں حتی الامکان برقرار رکھ کر دیگر ضروری اصطلاحوں کا ترجمہ فارسی عربی کی مدد سے کر لیا گیا تھا - مگر بعد میں جب حکومت کی پالیسی بدلی اور انگریزی زبان کو نیچے سے لے کر اوپر تک مسلط کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں انگریزی ہی بطور ذریعہ تعلیم استعمال ہونے لگی - اس مرحلہ پر قوم کے بعض درد مند و زی فہم بزرگوں نے یہ سوچا کہ اگر ہم نے ان جدید علوم کو جو انگریزی زبان کے ذریعہ ہم تک پہنچتے ہیں اور جن کی تعلیم سرکاری درسگاہوں میں دی جا رہی ہے اردو میں ترجمہ نہ کیا اور اپنے طلبہ کے لیے اپنی درسگاہوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا تو ہم اپنی آئندہ اعلیٰ تعلیم کے لیے دائماً انگریزی کے محتاج ہو جائیں گے اور اپنی تعلیمی و ثقافتی روایات کو قائم نہ رکھ سکیں گے - اس خطرے کے پیش نظر اردو ترجموں کی منصوبہ بندی کی گئی - شمالی ہند میں دہلی کے علاوہ لاہور علی گڑھ اور لکھنؤ میں اردو تراجم کا سلسلہ جاری ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزی سے اردو میں علمی اصطلاحات وضع کی جانے لگیں - سب سے پہلے دہلی کالج میں اور ایک عرصہ کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں اردو ذریعہ تعلیم کا تجربہ بڑی کامیابی کے ساتھ عمل میں آیا - یہ تمام کوششیں اور تجربے ہماری ادبی تاریخ میں محفوظ ہیں ۳

وضع اصطلاحات کی مہم بڑے پیمانے پر اس وقت شروع ہوئی جب حیدر آباد دکن کی حکومت نے اردو زبان کی سرپرستی کا بیڑا اٹھایا اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں اسے رائج کر دیا - اس انقلابی اقدام سے اردو کی ترقی کے لیے بہت سی راہیں کھل گئیں - جامعہ عثمانیہ میں ایک دارالترجمہ قائم

کیا گیا جس کی ایک مجلس وضع اصطلاحات بھی وجود میں آئی - اس مجلس کو پورے ہندوستان سے قابل ترین اہل علم کی ایک اچھی خاصی تعداد کا تعاون حاصل ہو گیا - انھوں نے مختلف علوم کی انگریزی اصطلاحات کے ترجمے نہایت موزوں اور اردو زبان کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے الفاظ میں کرکے جدید علمی کتابوں کے ترجمے بڑے پیمانے پر کرنے کا راستہ ہموار کر دیا ان ہی حضرات میں سے ایک پروفیسر وحید الدین سلیم صاحب بھی تھے جنہیں شمالی ہند سے طلب کیا گیا اور انھوں نے ایک خاصی ضخیم کتاب "وضع اصطلاحات"۴ کے عنوان سے لکھ کر اصطلاحات وضع کرنے کے نہایت موزوں اور فطری اصول پیش کیے جن کی مدد سے اصطلاح سازی کی ایسی روایات قائم ہو گئیں جن پر چل کر آج تک مختلف علوم کی بے شمار اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے - جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی عہد کے ان کارکنوں میں جنھوں نے وضع اصطلاحات اور علوم و فنون کے ترجموں کی مہم کو کامیاب بنایا - پروفیسر سید حسین بلگرامی (جو بعد میں نواب الملک کے خطاب سے مشہور ہوئے) بابائے اردو مولوی عبدالحق ، مولانا ظفر علی خان ، مولوی محمد الیاس برنی ، مولوی سید علی رضا بیرسٹر ، مرزا محمد ہادی اور اسی مرتبہ کے بعض دیگر بلند پایہ ادیبوں کے نام سرفہرست ملتے ہیں انھوں نے نہایت موزوں اور بآسانی زبانوں پر چڑھنے والی اصطلاحیں وضع کرکے اور انھیں اپنے ترجموں میں عملاً استعمال کرکے آنے والی نسلوں کی بہترین رہنمائی کا حق ادا کیا - ان مایہ ناز ادیبوں کی وضع کردہ اصطلاحوں کے مجموعے آج بھی انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہیں اور اصطلاح سازی کا کام ان ہی اصولوں پر چل رہا ہے جو ان بزرگوں نے وضع کیے تھے -

پاکستان بنا تو کراچی یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی ہی دو ادارے ایسے تھے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ورثہ کو اپنا کر اردو کو ذریعہ تعلیم بنا سکتے تھے مگر بوجوہ چند در چند جن میں سیاسی و انتظامی وجوہ اور ذاتی مصلحتیں زیادہ اور تعلیمی وجوہ کم تھے ، یہ جرأت مندانہ قدم نہ اٹھایا جا سکا اور صرف اتنا ہی ہو سکا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی وائس چانسلری کے زمانہ میں سب سے پہلے کراچی یونیورسٹی

نے اپنے امتحانات کے لیے اردو کو انگریزی کے ساتھ ایک متبادل زبان کے طور پر استعمال کی اجازت دے دی اور اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی نے بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا ۔ کراچی یونیورسٹی نے اس اقدام کو کامیاب بنانے کے لیے جامعہ کے اندر ایک شعبہٗ تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم کر دیا اور اس شعبہ کے ماتحت وضع اصطلاحات کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ پر مشتمل مختلف علوم و فنون کی مجالس قائمہ سرگرمی سے کام کرنے لگیں ۔ اسی طرح کی ایک مجلس ترجمہ پنجاب یونیورسٹی میں بھی قائم کی گئی اور اس نے بھی اصطلاح سازی کا کام شروع کر دیا ۔ چند سال کے عرصہ میں سائنسی علوم اور سماجی علوم کی اصطلاحات کا ایک بڑا ذخیرہ تیار ہو گیا اور اس کی اصطلاحیں اساتذہ اور طلبہ کے استعمال میں آنے لگیں ۔ کراچی یونیورسٹی کا شعبہٗ تصنیف و تالیف و ترجمہ اب تک اصطلاحات کی تقریباً دس فرہنگیں شائع کر چکا ہے ۔ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اپنی اصطلاحات کافی تعداد میں شائع کی ہیں ۔ قومی زبان کے فروغ کے لیے جو سرکاری ادارے قائم کیے گئے مثلاً مرکزی اردو بورڈ لاہور (جس کا نام اب اردو سائنس بورڈ ہو گیا ہے) اردو اکیڈیمی بہاولپور ، فیڈرل لاء پبلیکیشنز ، مجلس زبان دفتری ، بنک دولت پاکستان کی مجلس اصطلاحات نے بھی وضع اصطلاحات کے کام میں حصہ لیا ہے ۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور نے تو ایک فرہنگ اصطلاحات (جامع) بھی آٹھ جلدوں میں شائع کی تھی جو حرف "اے" سے لے کر حرف "این" تک چل کر ختم ہو گئی اس فرہنگ کو شروع کرتے وقت کچھ ایسا بھی ارادہ تھا کہ اصطلاحات کے استناد کا بندوبست بھی کیا جائے گا مگر اس منصوبہ پر عمل نہ ہو سکا ۔ مقتدرہ قومی زبان نے بھی اپنے قیام کے بعد مختلف علوم کی مجالس قائم کرکے وضع اصطلاحات کا کام انجام دیا اور اب ان کی فرہنگوں میں اصطلاحات کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے ۔ انھوں نے بعض ایسے فنون کی اصطلاحات بھی وضع کی ہیں جن کا اب تک ترجمہ نہیں ہوا تھا ۔ اس سلسلے کے آخر میں ایک شخص واحد کی اولوالعزمی کا ذکر بھی بہت ضروری ہے ۔ پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر منہاج الدین نے اپنی طویل ملازمت کے دوران فرصت کے اوقات میں بیس سال تک مسلسل کام کرکے ایک "قاموس الاصطلاحات"[۹] تیار کی جو ساٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے

اور سائنسی و سماجی دونوں زمروں کے علوم پر محیط ہے ۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس حیثیت سے قابل قدر ہے کہ آج اگر کسی مترجم کو مختلف علوم کی اصطلاحات کسی ایک جلد کے مجموعہ میں مل سکتی ہیں تو وہ یہی قاموس ہے ۔ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کا کوئی اور مجموعہ ایسا نہیں ہے ۔ مختلف اداروں کی طرف سے شائع کردہ فرہنگوں میں آپ کو بہت سی اصطلاحوں کی تکرار بکثرت ملے گی ۔ اس لیے جملہ وضع کردہ اصطلاحوں کی مجموعی تعداد ان اعداد و شمار کی میزان سے متعین نہیں ہو سکتی جو ہر ادارہ اپنی وضع کردہ اصطلاحوں کے متعلق شائع کرتا ہے ۔ بعض صورتوں میں انگریزی اصطلاح کے لیے متعدد اردو اصطلاحیں وضع کی ہوئی موجود ہیں ۔ خود پروفیسر منہاج الدین کی قاموس میں بھی یہ صورت حال جابجا نظر آتی ہے کیونکہ انھوں نے بھی زیادہ تر ان ہی اداروں کی فرہنگوں سے اصطلاحات اخذ کی ہیں ۔ جو ایک انگریزی اصطلاح کے لیے کئی کئی اردو اصطلاحیں وضع کر لیتے ہیں ۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں جو وضع اصطلاحات کے متعلق ہے اس قسم کے پچاس نمونوں پر بحث کی تھی جن میں کسی اصطلاح کے لیے ایک کے بجائے متعدد مترادفات وضع کر لیے گئے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا فیصلہ مترجم پر چھوڑ دیا گیا ہے ۔ میں ان مثالوں کو دہرا کر وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا صرف اس مضمون کا حوالہ کافی ہے ۔

غالباً آپ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ مختلف ذمہ دار اداروں کی مطبوعہ فرہنگوں میں جن کی تعداد تقریباً چار سو پچاس ہے[۸] ایک اصطلاح کے لیے متعدد اصطلاحیں کیوں درج ہوتی چلی آ رہی ہیں ۔ اس کا سبب بالکل ظاہر ہے ۔ جب کسی ادارے کی مجلس وضع اصطلاحات کو اپنی تحقیقی کارروائی کے دوران کوئی اصطلاح ایسی ملی ہے جس کے لیے متعدد اصطلاحات وضع کی ہوئی پہلے سے موجود ہیں تو انھوں نے ان سب کو اپنا کر اپنی فرہنگ کے مسودہ میں شامل کر لیا ہے یا خود اس مجلس کے ارکان میں سے متعدد ارکان نے کسی ایک انگریزی اصطلاح کے لیے اپنی اپنی سوچی ہوئی اصطلاحات وزنی دلائل کے ساتھ پیش کی ہیں تو کسی ایک اصطلاح کو کثرت آرا سے اختیار کر لینے کے بجائے ان سب کو شامل مسودہ کر لیا گیا ہے ۔ اغلب خیال یہ ہے کہ ایسا کرنے میں ان کی

لیت یہ رہی ہوگی کہ ہم متعدد ارکان کی تجاویز میں سے کسی ایک تجویز کو کثرت آرا سے قبول کرکے مفت کا جھگڑا کیوں مول لیں ۔ آئندہ جب کوئی بالادست ادارہ ایسا مقرر ہوگا جو ساری اصطلاحات کے لیے موزوں الفاظ کا حتمی فیصلہ کرکے استناد کے فرائض انجام دے گا ، تو وہ منجملہ دیگر اصطلاحات کا بھی فیصلہ کر دے گا اور اس کا فیصلہ جملہ متعلقہ حضرات کو طوعاً وکرہاً قبول کرنا پڑے گا ۔ مگر اب تک ان کی یہ آرزو کہ "مردے از غیب بروں آیدوکارے بکند" پوری نہیں ہوئی ہے اور استناد اصطلاحات کا بیڑا کسی نے نہیں اٹھایا ہے اور نہ اس غرض کے لیے کوئی مرکزی ادارہ پورے اختیارات کے ساتھ متعین ہوا ہے ۔

آج سے تقریباً ساٹھ سال قبل جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے دور میں اس کے دارالترجمہ کی مجلس وضع اصطلاحات نے اس طرف قدم بڑھایا تھا ، اس کی مطبوعات میں سنہ ۱۹۲۶ء کی مطبوعہ ایک جلد "مجموعہ اصطلاحات" کے عنوان سے ملتی ہے جس میں سنہ ۱۹۱۹ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۳ء تک کی مستند اصطلاحات جمع کی گئی ہیں اس مجموعہ پر دیباچہ کے آخر میں مولوی عنایت اللہ ناظم شعبہ نے لکھا ہے :

"امید کی جاتی ہے کہ اس مجموعہ سے نہ صرف جامعہ عثمانیہ کے مترجمین و مؤلفین کو آئندہ مدد ملے گی بلکہ جس کو بھی ترجمہ کا شوق ہوگا اس سے فائدہ اٹھا سکے گا اور اس طرح انگریزی علمی کتابوں کے ترجموں میں بھی جہاں تک اصطلاحات سے بحث ہے ایک قسم کی یکسانیت پیدا ہو جائے گی جو اردو زبان میں علم کی ترقی کا باعث ہوگی ۔"۱

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی انگریزی اصطلاحات کے لیے اردو مترادفات کے تعدد سے پریشانی ہونے لگی تھی اور اسے دور کرنے کے لیے یکسانیت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس کے تحت یہ مجموعہ مرتب کیا گیا تھا ۔ اس وقت سے اب تک ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصہ میں یہ انتشار بہت زیادہ بڑھ گیا ہے مگر اصطلاحات میں یکسانیت کے لیے کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اٹھایا گیا ہے ۔ جامعہ عثمانیہ کا مذکورہ بالا مجموعہ اس قسم کا پہلا اور آخری

گذشتہ سال یہ خبر بڑی مسرت کے ساتھ سنی گئی تھی کہ مقتدرہ قومی زبان نے ڈاکٹر سید عبداللہ کو جو اردو زبان کے ماہر خصوصی ہیں اور ترجمہ کے جملہ مسائل پر عبور رکھتے ہیں، اپنی مجالس وضع اصطلاحات کے ارکان کو مخاطب کرنے اور انھیں وضع و استناد اصطلاحات کے اصولوں سے باخبر کرنے کی دعوت دی تھی اور انھوں نے اس دعوت کو قبول کرکے ارکان مجالس وضع اصطلاحات کے ایک اجتماع میں تقریر فرمائی ہے ۔ پھر مقتدرہ نے ایک پمفلٹ کی شکل میں یہ تقریر شائع بھی کر دی جس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے :

"آج کل استناد کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ہر ادارے کو وضع اصطلاحات کی آزادی ہے اس کے باعث وضع شدہ اصطلاحات میں بے ضرورت کثرت پیدا ہو گئی ہے اور استناد کرنے والوں کا کام بڑھنے کے علاوہ اختلاف اور ناموزونیت کی بڑی گنجائش پیدا ہوگئی ہے ۔ مناسب ہے کہ اصطلاحات بنانے والے کم سے کم ہوں اور یہ اختیار ایک ہی ادارے کو حاصل ہو ۔

استناد کی دوسری مشکل یہ ہے کہ موجودہ استناد کمیٹیوں کا حکم ناطق اور فیصلہ کن نہیں ۔ دوسرے ممالک میں استناد کو مستند اور جائز قرار دینے کے لیے ایک قوت نافذہ ہوتی ہے ۔ جس کا حکم ناطق اور واجب التعمیل ہوتا ہے ، پاکستان میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے مثلاً یہ اختیار مقتدرہ قومی زبان کو دے دیا جائے تو معاملہ طے ہو جاتا ہے ۔"۲

ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ پورے مسئلہ کا خلاصہ ہے میں نے اپنے اس مضمون میں جس کا حوالہ میں اوپر دے چکا ہوں استناد کے لیے ایسی ہی ایک مستقل مرکزی مجلس کی تجویز پیش کی تھی اور اس پر زور دیا تھا کہ اس کے فیصلے حتمی اور اس اعتبار سے واجب التعمیل ہونے چاہییں کہ پھر جتنے بھی ترجمے کیے جائیں ان سب میں وہی اصطلاحات استعمال کی جائیں جو مستند قرار دی جا چکی ہوں تاکہ تمام درسی کتابوں میں یکسانیت پیدا ہو جائے ۔ جو کتابیں اس وقت موجود ہیں ان کی دوسری اشاعتوں میں بھی اس کا اہتمام کیا جائے کہ وہ پہلی اصطلاحات جو مستند نہ ہوں تبدیل کر دی جائیں ۔ حکومت کا ایک

اعلان ، خواہ آرڈیننس کی شکل میں ہو یا ایکٹ کی شکل میں ہو یا کابینہ کا کوئی حکم نامہ ہو ، مقتدرہ کی مجلس استناد کے فیصلوں کو مطلوبہ قانونی حیثیت دے سکتا ہے ۔ بعض دیگر ممالک میں بھی اس قسم کے قطعی اختیارات مستند اداروں کو دے گئے ہیں اور علمی و ادبی حلقوں نے انھیں تسلیم کیا ہے ۔ کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں اس طریقہ پر عمل درآمد نہ ہو سکے ۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے جامعاتی یا ادبی اداروں پر جو وضع اصطلاحات کا کام کر رہے ہیں یا آئندہ کرنا چاہیں کسی قسم کی امتناعی پابندی لگا دی جائے ۔ انھیں بھی وضع اصطلاحات کا اختیار اس شرط کے ساتھ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی وضع کی ہوئی اصطلاحات کو مجلس استناد کے سامنے لازماً پیش کریں گے اور اس مجلس کے فیصلوں پر بغیر چوں و چرا عمل پیرا ہوں گے ۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصطلاح کے معنی ہیں کوئی ایسا لفظ جس کے کوئی خاص معنی کسی علم یا فن کے ماہرین یا کسی جماعت نے مقرر کر لیے ہوں ۔ اس طرح جب کوئی لفظ کسی خاص معنی کے لیے مختص ہو جاتا ہے تو پھر اس کے اجزائے ترکیبی یا اس کے ماخذ یا لسانی خصوصیات کوئی معنی نہیں رکھتیں پھر تو اس لفظ سے وہی خاص مفہوم مراد ہوتا ہے جس کے لیے اسے وضع کیا گیا ہے ۔ اس لیے وضع اصطلاح کے وقت تو کسی علم یا فن کے ماہرین اس لفظ کے لاحقہ و سابقہ اور اس کی ترکیب صرفی و نحوی پر غور کرکے اپنا فیصلہ صادر کر سکتے ہیں مگر جب ایک مرتبہ کسی اصطلاح کے لیے اسے وضع کر لیا جائے تو پھر کسی بحث کا کوئی سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے ۔ انگریزی یا کسی زبان میں جو اصطلاحات آج کل استعمال ہو رہی ہیں انہیں بھی کبھی اسی طرح وضع کیا گیا ہوگا اب اگر سالہا سال جاری رہنے کے بعد انھیں از سر نو زیر بحث لایا جائے تو ہر اصطلاح پر کچھ نہ کچھ اعتراضات پیدا ہو جائیں گے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا ۔ اس لیے اب ان پر کسی نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیے ۔ سب انھیں قبول کرتے ہیں ۔ ہم بھی اگر ایک مرتبہ استناد کا طریقہ جاری کرکے اس کا نفاذ کردیں گے تو پھر ہر قسم کی گفتگوئیں

ختم ہو جائیں گی اور مستند اصطلاحات کو عام لغات میں ان کی جگہ پر بلا حیل و حجت داخل کیا جا سکے گا ۔

مجلس استناد کے بارے میں صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے ۔ اس مجلس کے کام کو دوسری مجالس وضع اصطلاحات کی طرح انجام نہیں دینا چاہیے ۔ جو بغیر کسی تجدید مدت یا تعین کارکردگی کے اطمینان کے ساتھ کام کیے چلی جاتی ہیں اور جتنے الفاظ ایک اجلاس میں ہو گئے ان پر قناعت کرکے آئندہ ایک ہفتہ یا ایک ماہ کے لیے اپنا اجلاس ملتوی کر دیتی ہیں ۔ مجلس استناد کے لیے مواد کا بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ اسے ہنگامی بنیاد پر کام کرنا چاہیے اور دو چار گھنٹے کی روزانہ نشست چند ماہ تک کر کے اس کام کو مکمل کر دینا چاہیے جہاں کسی ایک اصطلاح کے لیے متعدد اصطلاحیں ہوں ان میں سے ایک کو منتخب کر لینا چاہیے اور زیادہ گہرائیوں میں جاکر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے ۔ جب ایک مرتبہ یہ طومار جو جمع ہو گیا ہے چھٹ جائے گا تو پھر جو نئی اصطلاحیں آتی رہیں گی ان سے بآسانی نمٹا جا سکے گا اور یہ کام برابر مکمل ہوتا رہے گا ۔ مجلس کے ارکان تین سے زیادہ نہیں ہونے چاہییں جن میں سے ایک سائنسی علوم کے لیے اور دوسرا سماجی علوم کے لیے مختص ہو (ان ارکان کو اپنے اپنے شعبوں میں مددگار مقرر کرنے کا حق ہونا چاہیے) اور مقتدرہ کی مجلس حاکمہ اس مجلس کا صدر اتفاق آرا سے مقرر کرے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سے زیادہ اس عہدے کے لیے کوئی اور شخص موزوں نظر نہیں آتا ۔

مرکزی مجلس استناد کا قیام لاہور میں اس لیے ضروری ہے کہ وہاں پنجاب یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالج موجود ہیں جن کے فاضل پروفیسروں میں سے موزوں ترین حضرات اس مجلس کی رکنیت کے لیے منتخب کیے جاسکتے ہیں ان کی مستقل رہائش یقیناً لاہور میں ہو گی ۔ مجلس استناد کے دفتر میں جہاں مجلس اپنے یومیہ اجلاس منعقد کرے ایک لائبریری ایسی ہونی چاہیے جس میں ہر قسم کی متعلقہ معلومات دستیاب ہوں ۔ اس کا ایک لائبریرین بھی ہونا چاہیے جو مجلس کی کارروائی کے دوران مطلوبہ معلومات بر وقت مہیا کرنے کے علاوہ مجلس کے فیصلوں

کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے ایک مددگار کی حیثیت سے کام کر سکے لائبریری میں حسب ذیل مدات کا معلوماتی مواد موجود ہونا چاہیے ۔

۱ - جو اصطلاحات اب تک وضع کی جا چکی ہیں ، خواہ وہ کسی ادارے کی ہوں یا کسی جامعہ کی مجلس وضع اصطلاحات نے مرتب کی ہوں یا کسی اہل علم کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہوں ، ان کی مطبوعہ فرہنگیں یا قاموسیں یا غیر مطبوعہ مجموعوں کی فوٹو اسٹیٹ نقول ۔

۲ - انگریزی زبان کی تمام مستند لغتیں بشمول انگریزی اردو لغات اور مختلف علوم و فنون کی انگریزی اصطلاحات کے مجموعے ۔

۳ - اردو زبان کی جملہ مستند لغات ۔

۴ - اردو قواعد کی کتابیں اور وضع اصطلاحات کے اصولوں پر مشتمل کتابیں ۔

۵ - فارسی ، عربی ، ترکی اور ہندی کی لغات ۔

۶ - دہلی کالج ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اور اورنٹیل کالج لاہور کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے منتخب سیٹ بطور نمونہ ۔

یہی لائبریری مقتدرہ کے دارالترجمہ کے کام بھی آسکتی ہے جس میں بیٹھ کر مترجموں کو بڑے پیمانے پر کام کرنا پڑے گا ۔ مجالس وضع اصطلاحات ، مجلس استناد اصطلاحات اور مختلف علوم کا ، جس میں سائنسی اور سماجی دونوں زمروں کے علوم شامل ہوں ، اردو ترجمہ یہ تینوں اقسام کے کام اصل میں دارالترجمہ ہی کے ذیل میں آتے ہیں ۔ اس لیے مقتدرہ کو پورے غور و خوض کے بعد فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا اس کے لیے حکومت کو یہ سفارش کرنا ممکن ہو سکے گی کہ اس کا صدر دفتر اسلام آباد ہی میں رہے اور دارالترجمہ کے طور پر اس کا ذیلی دفتر لاہور میں ہو ۔

سماجی علوم ہو یا سائنسی علوم ان کے ترجمہ کا کام وسیع پیمانے پر مقتدرہ قومی زبان کو فوری طور پر اپنے ذمہ لینا ہی پڑے گا ۔ جب حکومت نے قومی زبان کو ابتدائی ، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجوں کے

بعد جامعات کے اعلیٰ درجوں میں بھی ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے اور اس کے متعلق ایک مدت کا تعین بھی ہو چکا ہے تو اب یہی وقت ہے کہ ان کتابوں کو تیار کیا جائے جو اردو ذریعہ تعلیم میں کام آئیں گی جس طرح دہلی کالج ، اورنٹیل کالج لاہور اور جامعہ عثمانیہ کو اردو ذریعہ تعلیم جاری کرنے سے قبل ہی اردو ترجموں کا اہتمام کرنا پڑا تھا اسی طرح آج بھی یہ کام سرکاری امداد سے سرکاری اداروں کے ذریعہ ہی کرنا پڑے گا ۔ یہ امید رکھنا بیکار ہے کہ موجودہ فضا میں جب کہ انگریزی ذریعہ تعلیم جاری ہے ملک کے تجارتی ادارے محض مستقبل کی توقعات پر اس قسم کی علمی کتابوں کی اشاعت کا بار برداشت کرلیں گے ۔ جدید علوم کے ایسے ترجمے جو درس و تدریس میں کام آسکیں اس طرح بے سوچے سمجھے نہیں کرائے جا سکتے کہ جس کتاب کا چاہا ترجمہ کرا لیا ۔ اس کے لیے تو ایک جامع پروگرام بنایا جائے اور مختلف علوم کی کتابوں کے سیٹ ترجیحی طور پر یکے بعد دیگرے ترجمے کرائے جائیں تو کافی عرصہ کے بعد کہیں وہ ضرورت پوری ہو سکے گی جو اردو ذریعہ تعلیم کو نافذ کرنے کے بعد اچانک پیش آئے گی ۔ اس مرحلہ سے گزر جانے کے بعد چند سال کے اندر جب اردو ذریعہ تعلیم کے فارغ التحصیل طلبہ جامعات سے نکلیں گے اور ان ہی کو تعلیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا موقع ملے گا تو اس وقت تراجم کے بجائے تصنیف و تالیف کا سلسلہ زیادہ سرگرمی سے شروع ہوجائے گا اور ملک کے اندر طباعت واشاعت کے بڑے بڑے ادارے بکمال شوق ورغبت ان نئی کتابوں کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں قبول کرلیں گے ۔ اردو ذریعہ تعلیم کے مکمل نفاذ سے قبل یہ سارا کام کسی سرکاری ادارے ہی کو انجام دینا ہوگا اور اس کے لیے مقتدرہ قومی زبان سے زیادہ اہل کوئی اور ادارہ نظر نہیں آتا ۔

مندرجہ بالا چند پیراگرافوں میں ترجمہ کے کام کو آسان بنانے اور جامعات کے اعلیٰ درجوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے مکمل نفاذ سے قبل مختلف علوم کی اتنی کتابیں تیار کر لینے کے لیے کہ ان سے آغاز کار کی ضرورت پوری ہو سکے ، اب تک مقتدرہ قومی زبان کے لیے تین منصوبے برائے غور پیش کیے گئے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے ۔

پہلا منصوبہ مترجموں کے لیے ایک ایسی جامع انگریزی اردو لغت مہیا کرنے سے متعلق ہے جو ان کے لغوی و لسانی ضروریات کی پوری طرح کفیل ہو سکے - اس کے لیے مولوی عبدالحق مرحوم کی مرتب کردہ لغت کو جس کی دو اشاعتیں انجمن ترقیٔ اردو شائع کر چکی ہے بنیاد بنا کر اس پر وہ عمارت تعمیر کی جائے جس کا نقشہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے - اس قسم کی جامع لغت سماجی علوم کے ترجمے کے لیے از بس ضرورت ہے -

دوسرا منصوبہ ایک مرکزی مجلس استناد اصطلاحات قائم کرنے سے متعلق ہے جو ان تمام اصطلاحات پر جو اب تک وضع کی جا چکی ہیں نظر ثانی کرکے ان کو ہر انگریزی اصطلاح کے لیے صرف ایک اردو اصطلاح کے اصول پر اپنی حتمی منظوری کی سند دے دے تاکہ اصطلاحات کے معاملہ میں جملہ ترجموں میں یکسانیت پیدا ہو سکے مقتدرہ کی اس مجلس استناد کے فیصلوں کو حکومت اپنے ایک واجب التعمیل حکم کے ذریعہ نافذ کرائے -

تیسرا منصوبہ ایک ایسے مرکزی دارالترجمہ کے قیام سے متعلق ہے جس کی ایک مخصوص لائبریری ہو جس میں بیٹھ کر مترجم مقتدرہ کی منتخب کردہ علمی کتابوں کا ترجمہ کریں اور اعلیٰ قابلیت کے ماہرین علوم ان کے ترجموں کی جانچ پڑتال کریں -

مقتدرہ کو یہ تینوں منصوبے فوری طور پر بیک وقت شروع کرنے چاہییں اور ان کے لیے الگ الگ بجٹ بنا کر اپنی سفارشات وفاقی حکومت کو پیش کرنی چاہییں - یہ منصوبے ہماری لیت و لعل کی عادت کے ساتھ آہستہ روی سے کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے - یہ کام بہت پہلے شروع ہو جانے چاہیے تھے - اب چونکہ ان کے آغاز میں کافی تاخیر ہو چکی ہے اس لیے انھیں ہنگامی بنیادوں پر زیادہ سے زیادہ انہاک کے ساتھ انجام دینا ہوگا - ان میں سے ہر منصوبے کے لیے حکومت کو اپنے ترقیاتی پروگرام میں کثیر رقوم مختص کرنی چاہییں - قومی زبان کو فروغ دینے اور ہر اعتبار سے دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ بنانے کا کام قومی ترقی کے دوسرے کاموں سے کمتر درجہ کا کام تو نہیں ہے -

اردو زبان نے گزشتہ نصف صدی کے دوران اپنی صحافت اور تنقیدی ادب کے پھیلاؤ کے باعث اظہار و بیان کے جو جدید اسلوب اپنائے ہیں - انھوں نے انگریزی اور اردو کے علم نحو کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے - اب اگر ہم انگریزی سے اردو میں ترجمہ نہ بھی کر رہے ہوں تو ہماری طبع زاد عبارتوں میں بھی انگریزی کے نحو کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے - اگر اس رجحان کو اپنی زبان کے قواعد سے ہم آہنگ پیدا کرکے اور زیادہ بڑھایا جائے تو ترجمہ کا کام آسان تر ہو سکتا ہے - انگریزی کے طویل جملوں کو لازمی طور پر توڑ کر کسی منطقی خیال کو منتشر کر دینے کے بجائے اگر ہم وقفوں کی علامات کے ذریعہ جملہ کی وحدت کو اس طرح قائم رکھ سکیں کہ مفہوم واضح ہو جائے تو کیا یہ ایک بہتر طریقہ نہیں ہوگا - میں اس قسم کے مسائل پر بھی جو ترجمہ کے میکانی پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں کچھ بحث کرنا چاہتا تھا مگر زیادہ وقت صرف ہو جانے کے باعث میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اب آپ کی مزید سمع خراشی کا کوئی حق حاصل ہے - مجھے امید ہے کہ میں نے اگر اپنے محدود علم کی بنا پر کچھ غلطیاں کی ہیں تو آپ انھیں معاف فرمائیں گے مگر ان کی نشاندہی ضرور کر دیں گے تاکہ میں خود یا کوئی فرد اور ان کی تصحیح کر سکے -

حواشی

۱ - کلیمنٹ سی - جے ویب مصنف ، ترجمہ مولوی احسان احمد نظرثانی ڈاکٹر منظور احمد ''تاریخ فلسفہ'' شائع کردہ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی ، (اشاعت ثانی ۱۹۶۹ء) پیش لفظ ڈاکٹر منظور احمد صفحہ ''د'' -

۲ - بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ''دی اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری'' شائع کردہ انجمن ترقی اردو (اشاعت ثانی ۱۹۶۸ء) -

۳ - بدر شکیب ''اردو کی سرکاری حیثیت اور ایسٹ انڈیا کمپنی'' ''کائنات'' شائع کردہ وفاقی اردو گورنمنٹ سائنس کالج ۱۹۸۰ء -

۴ - مولوی عبدالحق ''مرحوم دہلی کالج'' شائع کردہ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۵ء، صفحہ ۱۷۱-۱۷۳ -

۵ - مولوی وحیدالدین سلیم ''وضع اصطلاحات'' شائع کردہ انجمن ترقی اردو (اشاعت ثالث) ۱۹۶۵ء صفحات ۱۷۵ تا ۲۲۳ -
مولوی عبدالحق ''خطبات عبدالحق'' مؤلف ڈاکٹر عبادت بریلوی شائع کردہ انجمن ترقی اردو (اشاعت ثانی ۱۹۲۵ء) صفحات۳۶۶-۳۶۷ -

۶ - پروفیسر شیخ منہاج الدین ''قاموس الاصطلاحات'' شائع کردہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۶۵ء صفحات ۸۹۳ ، الفاظ ساٹھ ہزار -

۷ - بلال احمد زبیری ''اردو زبان میں تراجیت'' اخبار اردو شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان مورخہ ۱۹۸۲ء صفحہ ۱۳ تا ۲۳ -

۸ - ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری''اردو اصطلاحات سازی'' (کتابیات) شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۴ء) -

۹ - مجلس وضع اصطلاحات دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ ناظم مولوی عنایت اللہ ''مجموعہ اصطلاحات'' شائع کردہ جامعہ عثمانیہ (۱۹۲۶ء) اقتباس از دیباچہ' ناظم شعبہ -

۱۰ - ڈاکٹر سید عبداللہ ''وضع و استناد اصطلاحات'' شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (اشاعت ۱۹۸۴ء) صفحہ ۸ -

---

گفتگو

ڈاکٹر انور محمود خالد

مقالہ : ڈاکٹر ظفر اقبال

تبصرہ : پروفیسر محمد انور بھٹی

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب :

جناب ڈاکٹر ظفر اقبال نے اپنے مقالے اور جناب پروفیسر محمد انور بھٹی نے اپنے تبصرے میں بعض اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے ، لیکن بعض امور کی وضاحت بھی ضروری ہے - مسئلہ یہ ہے کہ مقتدرہ قومی زبان نے اب تک سائنس سے متعلق کتب کو ہاتھ نہیں لگایا - سائنسی کتب کا جائزہ اردو سائنس بورڈ کے ذمہ ہے - جب کہ مقتدرہ صرف سائنسی اصطلاحات کی معیار بندی کا کام سر انجام دے رہا ہے - گو اردو سائنس بورڈ کے ساتھ ہمارا رابطہ بہر حال قائم ہے مگر مقتدرہ نے اپنے آپ کو فی الحال سماجی علم تک محدود رکھا ہے اور ساتھ ساتھ سائنسی اصطلاحات کی معیار بندی کر رہا ہے - جہاں تک ثانوی تعلیم کا تعلق ہے اس سطح تک نصابی کتابوں کا جائزہ لینا انٹر بورڈ کے دائرہ کار میں ہے - اس سے اوپر کی کتب کے سلسلے میں ہم لوگ اپنا کردار ادا کر رہے ہیں -

ڈاکٹر رفیق احمد :

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ایک انتظامی مسئلہ چھیڑا ہے - یہ طے شدہ امر ہے کہ تقسیم کار کوئی آسانی صحیفہ نہیں ہے - جس میں تبدیلی نہ لائی جا سکے - یہ قوم و ملک کا تقاضہ ہے - جس کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کی جا سکتی ہے - بہر حال اس پر آگے چل کر بحث ہوگی -

سرور کامران :

ماضی میں جو سائنسی کتب ترجمہ ہوئیں وہ تادیر پذیرائی حاصل نہ کرسکیں ۔ اس کا سبب ان ترجمہ شدہ کتب میں استعمال ہونے والی اصطلاحات تھیں ۔ ان اصطلاحات کے تراجم اس قدر ثقیل اور نامانوس تھے کہ طلبہ کے لیے انھیں یاد رکھنا آسان نہ تھا ۔ اگرچہ طلبہ کو اردو میں جواب دینے کی ضرورت ہے ۔ لیکن ترجمہ کی مشکل اس کی راہ میں حائل ہے ۔

طارق محمود :

وضع اصطلاحات میں پرانی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ نئی نئی اصطلاحیں بھی سامنے آ رہی ہیں ان کی معیار بندی کی فوری ضرورت ہے ۔ بین الاقوامی سطح پر استعمال ہونے والی اصطلاحوں کو بعینہٖ قبول کر لیا جائے تو مناسب ہوگا ۔ لیزر کو لیزر ہی کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے ۔ اسی طرح علامات اور ترقیات کا مسئلہ بھی اہم ہے ۔ سونے کو "au" ہی کہا جاتا رہے گا ۔ اگرچہ یہ دو عملی ہے مگر فی الحال یہ تو رہے گی ۔ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے وہی نام رہنے چاہییں جو حیوانیاتی اور نباتاتی سائنس میں بین الاقوامی سطح پر قابل فہم اور قابل قبول ہیں ان کے ساتھ ساتھ طلبہ کو سمجھانے کے لیے عام فہم ناموں کا اندراج بھی ہو جائے تو مناسب ہوگا ۔ "Indian Trees" میں مصنف نے سائنٹفک ناموں کے علاوہ عام فہم بھی درج کر دیے ہیں ۔ جس سے طلبہ کو ان درختوں کے نام سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے ۔

ایک مسئلہ سائنس میں بچوں کی کتابوں کی ضرورت کا ہے ۔ بنیادی کتابوں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ متعلقہ اداروں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے ۔

سائنسی کتابوں کے مترجمین کی حوصلہ افزائی کے لیے خصوصی انعامات اور مالی امداد کی بھی ضرورت ہے ۔

سرور کامران :

ماضی میں سائنسی کتب کا ترجمہ اس قدر نہ ہو سکا ۔ جس قدر اس کی ضرورت تھی ۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں نہ ہوا ؟ کیا ان سائنسی

کتب کا ترجمہ مشکل تھا یا اس کی پذیرائی نہ ہونے کا خدشہ تھا ۔ میرے خیال میں اس کا ایک سبب یہ تھا کہ جو سائنسی کتب تھیں ۔ وہ ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ ایس ۔ سی کے درجات میں پڑھائی جا رہی تھیں اور اگلے چند سالوں میں ان میں علم کا اس قدر اضافہ ہو گیا کہ بیشتر علم کو بی ۔ اے ، بی ۔ ایس ۔ سی تک لانا پڑا ۔ چنانچہ ترجمہ کی رفتار اس کا ساتھ نہیں دے سکی ۔ کچھ مسئلہ اس میں ہم نے اپنے نصاب اور ذریعہ تعلیم سے بھی پیدا کیا ہے ۔ جو طالب علم حساب یا فزکس اردو میں پڑھتا ہے ، جس وقت وہ کالج میں آتا ہے ، تو پہلا سال اس کا نئی اصطلاحات سیکھنے میں لگ جاتا ہے ۔ پہلے وہ "دو درجی مساوات" پڑھتا رہتا ہے ۔ فسٹ ایئر کی کلاس میں آتے ہی اسے بتایا جاتا ہے کہ اسے "Quadratic" کہتے ہیں ۔ پہلے وہاں وہ جذر کہتا رہتا ہے ۔ اب اسے "Root" کہتا ہے ۔ نتیجتہً تحصیل علم کی اس تگ و دو میں رکاوٹیں ترجمہ کی وجہ سے بار بار آتی ہیں ۔ علم کے حصول کی کوشش کم تر رہ جاتی ہے اور دشواریاں بار بار اسے تنگ کرتی ہیں ۔ چنانچہ بعد کے جتنے سال وہ یونیورسٹی میں گزارتا ہے وہ ان اصطلاحوں کو یاد کرنے میں گزار دیتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام سے ایک طرح کا خوف اور ڈگری کے حصول کی لگن اس میں زیادہ رہتی ہے ۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ جو قومی زبان میں لکھے گئے چند صفحات ہیں ۔ انھیں طالب علم زیادہ تیزی سے پڑھ سکتا ہے ۔ انگریزی میں اس کے پڑھنے کی رفتار بڑی ریاضت کے بعد بنتی ہے اور جب اس کی رفتار بنتی ہے تو وہ یونیورسٹی چھوڑ چکا ہوتا ہے ۔ نتیجۃً علم کے حصول کا جو معیار بننا چاہیے تھا ، وہ نہیں بن پاتا ہے ۔ آئندہ صورت حال مزید تبدیل ہوگی ۔ اس وقت انگریزی میڈیم سکولوں کے طالب علم دستیاب ہو جاتے ہیں ۔ لیکن ۱۹۸۹ء کے بعد جب اردو میڈیم کے طلبہ کالجوں میں پہنچیں گے تو صورت حال زیادہ گھمبیر ہوگی ۔ اس لیے یہ مسئلہ نہایت بنیادی نوعیت کا ہے ۔ جو فوری توجہ چاہتا ہے ۔

ڈاکٹر رفیق احمد :

میڈیکل کے طلبہ کو بھی ایسی ہی مشکلات درپیش ہیں ۔ ایف ایس سی کے بعد طلبہ جب میڈیکل کالجوں میں پہنچتے ہیں ۔ تو سب اصطلاحات ان کے لیے نئی ہوتی ہیں اور وہاں انھیں ہر شے از سر نو سیکھنا ہوتی ہے ۔

طارق محمود :

سائنس کی کتابوں کی حوصلہ افزائی ناشروں کی طرف سے بھی نہیں ہوئی ، کوئی ناشر اتنا بڑا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں کہ وہ ایسی مہنگی کتاب شائع کرے جس کی نکاس کی کوئی صورت نہ ہو ۔

اسلم فرخی :

سائنس کی کتابیں ترجمہ ہوتی رہی ہیں مگر عدم استعمال کے سبب ان میں ترجمہ شدہ اصطلاحیں رائج نہ ہوسکیں ۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں اناٹومی کی ایک ترجمہ شدہ کتاب آج بھی دیکھی جا سکتی ہے ۔ یہ کتاب میک گرے ہل کی اناٹومی سے بھی زیادہ ضخیم ہے ۔ اس کا ترجمہ ۱۸۶۰ء میں ہوا ۔ ظاہر ہے ، اس کی اصطلاحات عام نہ ہو سکیں ۔

ڈاکٹر وحید قریشی :

عربی اور فارسی کی دیرینہ روایت سے جس طرح ہماری نسل اپنے بچپن میں وابستہ تھی ، وہ روایت اب زوال آمادہ ہے ۔ بعد میں انگریزی کا غلبہ آیا ، تہذیبی اور ثقافتی سرمایے سے رابطہ قائم نہ رہا اور آج صورت حال یہ ہے کہ انگریزی زبان کے حوالے سے ایک ایسا انتہا پسند طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ کو رہنے دیا جائے ۔ اسی دوران اہم بات یہ بھی ہوئی کہ ہمارے ہاں ایک مستقل تعلیمی پالیسی کا فقدان رہا ہے ۔ جس طرح سیاسی ، سماجی اور خارجہ پالیسیاں ضرورت کے تحت مرتب ہوتی رہی ہیں ،تعلیم کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا ہے ۔ حالانکہ ضرورت تھی کہ تعلیم کے سلسلہ میں طویل المعیار اور وسیع المقاصد پالیسیاں بنائی جائیں ۔

اشفاق احمد :

سب سے پہلے سوال یہ ہے کہ اردو کیوں ؟ اس کا جواب یہ ہے ، کہ جو کچھ ہم پڑھنا سیکھنا چاہتے ہیں ، یا مافی الضمیر آسانی سے سمجھ میں آجائے اس لیے یہ زبان ضروری ہے ۔ ہم نے ابھی تک سائنسی درسی کتب کا ترجمہ نہیں کرایا اور بی ۔ ایس ۔ سی کی کتب جو سائنسی موضوعات پر لکھوائی گئیں ، وہ ایک لحاظ سے طبع زاد ہیں میرے نزدیک یہ ایک صحت مند رجحان ہے ، اس وقت کراچی یونیورسٹی میں ۵۰% سے زائد

طلبہ اردو میں جوابات تحریر کرتے ہیں جبکہ پنجاب کی یونیورسٹیوں میں یہ صورت حال نہیں ہے ، یہ ایک مسئلہ ہے جو غور طلب ہے ۔ سائنس ہی کے ضمن میں ایک بات اور ہے جسے کسی طرح بھی رد نہیں کیا جا سکتا ، وہ یہ ہے کہ ہم نے اب تک سائنس کے بہترین پروفیسر تو پیدا کیے ہیں ، سائنس دان پیدا نہ کر سکے ۔ سائنسدان تو اس وقت پیدا ہوگا ، جب وہ اپنی زبان میں سوچنا شروع کر دے گا اور جب وہ لیبارٹری میں جائے گا تو اس کی جو کاپی ہوگی جس پر وہ نوٹ لکھتا ہے وہ اردو میں ہوگی ۔ اس کی اس نوٹ بک میں سائنس کے علاوہ کئی باتیں اور بھی شامل ہوں گی ۔ دنیا کا یہ عجیب و غریب مسئلہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو مربوط سمجھتی ہے ان علما اور جو تعلیم حاصل کرتے ہیں یا تعلیم دیتے ہیں ۔ ٹیکنالوجی کا تصور جب بھی ذہن میں آتا ہے تو ان کے ساتھ لوہار ، ترکھان ، جلد ساز اور دوسرے لوگ ذہن میں آ جاتے ہیں ۔ جن کا اصل میں ٹیکنالوجی سے تعلق ہے اور آپ لوگ ان کا ذکر کرنے کو تیار نہیں ہوتے ۔ حالانکہ پاکستان میں ٹیکنالوجی کی تعلیم دینی ہے ۔ تو سب سے پہلے ان لوگوں سے ملنا اور رشتہ قائم کرنا ہوگا جو اس میدان میں تجربہ رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں ۔ مثلاً آپ کے علاقے میں اس وقت گوجرانوالہ ، وزیر آباد ، سیالکوٹ ، گجرات میں کئی پرانے خاندان آباد ہیں بہتر ہے یہاں گورنمنٹ کا کوئی ادارہ قائم ہو جائے جو اردو میں نئی اختراعات ، نئی ایجادات اور نئی ترقیوں سے روشناس کرائے ۔ سیالکوٹ میں ایک ادارہ جو بڑی دیر سے کوشش کر رہا ہے کہ ایک ایسی گلو بنا سکے جو لکڑی کی گرفت کو مضبوط بنا دے اور وہ ''adhesives'' کی سائنس پڑھے بغیر یہ کام کر رہا ہے ۔ انھوں نے یہ سائنس نہیں پڑھی ۔ لیکن علمی طور پر اس سائنس سے وہ صدیوں سے گزر رہے ہیں ۔ ہماری ساری توجہ بی ۔ ایس ۔ سی کے طالب علموں کو کیا ہم اردو میں پڑھائیں ۔ یہ فیصلہ ہمارے کرنے کا ہے کہ آگے جاکر بھی ہم ان کو اردو میں پڑھائیں گے ۔ ہماری تعلیم کا آج دو طرفہ ہے ، ایک طرف ٹیکنالوجی کی تعلیم ہے اور دوسرا یہ کہ ان علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کارنامے سارے سائنسی علوم کا اردو میں ترجمہ کرنا مشکل ہے ، کہ ہمارے پاس ترجمے کی اتنی سہولتیں موجود نہیں ہیں ۔ ایک شور تھا کہ کمپیوٹر آگیا ہے تو اس سے مدد لیں ۔ اس موقع پر جذباتی ہونے کی

ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ایک ملک ہے جاپان۔ اشیا میں بڑا ترقی یافتہ ملک ہے، امریکہ بھی اس کو مانتا ہے کیونکہ ایف ۱۶۰ میں ۳۲ فیصد پرزے جاپان سے بنے ہیں۔ جاپان میں کل ۸۱ آدمی ہیں۔ جو انگریزی جانتے ہیں۔ ان کی ترقی کا راز صرف ان کی قومی زبان جاپانی ہے جاپان کی ساری سائنسی تعلیم جاپانی میں ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس ملک نے اپنی زبان کے ساتھ ہی وابستہ رہنے کے بعد کیسے ترقی کی ہے۔ میری گزارش ہے کہ ان مسائل کو اس طرح پرانے طریقے سے حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے جس طرح ہم ۱۹۰۱ء میں کرتے تھے۔ جتنی بھی سائنس ہے وہ ساری بین الاقوامی اصطلاحات میں ہے۔ میری درخواست ہے کہ سائنسی عمل کو سمجھانے اور وضع کرنے کے لیے جو کہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ یہ ادبی مشکل بھی ہے۔ اگر تو لوگوں کو سمجھانا ہے اور آنے والی نسلوں کو آسانیاں فراہم کرنی ہیں، تو یہ بہت ضروری ہے کہ آپ کچھ غور کریں کہ ان کو یہ آسانی فراہم کی جاسکتی ہے یا کہ نہیں اور یہ آسانی کس طرح فراہم ہو سکتی ہے۔ ترجمہ کرکے یا انٹر نیشنل ٹرمینالوجی کو بعینہٖ قبول کرکے۔

ڈاکٹر نذیر رومانی :

میں اشفاق احمد کے لفظ کو لیتے ہوئے معروف انداز میں کچھ عرض کروں گا۔

پہلی بات اصطلاحات اور یہ کہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بارے میں ہے۔ میرے خیال میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں دو متضاد آرا نہیں ہیں۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے قومی سطح پر حکومتی سطح پر فیصلہ ہو چکا ہے۔ سوال اس اہمیت اور کوشش کا ہے جو ہم نے کرنی ہے۔ ”نکسن“ نے اپنی کتاب میں ایک مقولہ درج کیا ہے، کہ کسی قوم کی ترقی کا انحصار اس قوم کے وسائل افرادی قوت اور قوت ارادی پر ہوتا ہے۔ قوم کی ترقی میں قوت ارادی کا بڑا کردار ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے جامعہ عثمانیہ نے بڑا شاندار کارنامہ سر انجام دیا سائنس کو اردو میں منتقل کیا۔ میری گزارش یہ ہے کہ اگر یہ کام ہو چکا ہے۔ تو پھر ہم بیٹھ کر کیا سوچ رہے

ہیں۔ وہ اصطلاحات جو وضع ہو چکی ہیں ان پر آج کتابیں کیوں نہیں لکھی جا رہی ہیں اور اگر لکھی جا رہی ہیں تو ان پر اعتراضات کیوں ہیں۔ ہمارے طالب علم ان کو کیوں نہیں پڑھتے اور ہمارے اساتذہ ان کو کیوں نہیں پڑھاتے۔ ان سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے میری یہ گزارش ہے کہ سائنس ساٹھ ستر سال سے بہت آگے آچکی ہے۔ جتنا علم ۱۹۷۵ء تک ساری تاریخ میں مجتمع ہوا وہ ایک طرف اور پچھلے دس سالوں میں تخلیق کیا گیا وہ ایک طرف ایکن ۱۹۷۵ء تک جو کچھ کیا گیا وہ علم آج دوگنا ہو چکا ہے۔ اس سے علم کی وسعت اور رفتار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں پرانی اصطلاحات کو لے کر نہیں چلایا جا سکتا۔ اس کے لیے اصطلاحات سازی میں نئے افق تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اصطلاحات کی شدید قلت ہے۔ سائنس کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر ترجمہ کرنے لگتے ہیں، تو خواہ وہ طبیعات کی کتاب ہو، کیمیا کی کوئی بھی ہو اصطلاحات کی کمی ترجمے کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ پہلے والی اصطلاحات کی بھی تراش خراش کرنی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک اصطلاح کا مفہوم بدل جاتا ہے اور اس لحاظ سے ہمیں تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ اگر آپ سائنس کی دو یا تین کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں ایک ہی مفہوم کی آپ دیکھیں گے کہ ایک کتاب میں ”ایسڈ“ لکھا ہوا ہے اور دوسرے میں ”تیزاب“ اور تیسرے میں ”ترشا“ لکھا ہوا ہے طالب علم کچھ سیکھنے کی بجائے مشکل میں پڑ جاتا ہے، اصطلاحات کا مسئلہ بہت ضروری ہے۔ انگریزی سے ہمیں اتنا خائف نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے صدر مقتدرہ سے میری گزارش ہے کہ اس کام کو جتنی جلدی ہو سکے پورا ہونا چاہیے۔ بے شک یہ ایک کٹھن کام ہے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے اگر ہم عربی، ہندی اور فارسی کی طرف رجوع کر سکتے ہیں تو انگریزی کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب نے بات کی تھی کہ جب ہم ترجمہ کرتے ہیں تو اس وقت مفہوم بدل جاتا ہے لیکن بریگیڈیر گلزار احمد صاحب فرما رہے تھے کہ ترجمہ کرتے وقت فنی ماہرین کی رائے بہت ضروری ہے۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار جناب اشفاق احمد صاحب نے بھی کیا کہ جو شخص ترجمہ کر رہا ہو تو اس سے پوچھا جائے کہ تم اس بات کو کیسے ادا کرتے ہو تاکہ روز مرہ کی زبان میں اس

کو لایا جا سکے ۔ مفہوم کے بارے میں میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ الیکٹرون کرے کے چاروں طرف موجود رہتا ہے یہاں پر لکھنے والا غلطی کر گیا ہے ، سائنس کی زبان میں محاورے کا استعمال عجیب سا لگتا ہے ۔ کرے کی تو چاروں اطراف نہیں ہوتی۔ غالباً لکھنے والا یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ الیکٹرون ہر طرف موجود رہتا ہے ۔ ایک اصطلاحات کی بات ہے ، تو دوسری مفہوم کی بات بھی ہے ۔ اس لیے فنی علوم کا ترجمہ فنی ماہر کے ہاتھوں سے ہو تو زیادہ بہتر بات ہے لیکن صرف سائنسدان یا فنی ماہر کی بات نہیں ہے ۔ ایک ماہر لسانیات بھی ساتھ ہونا چاہیے تاکہ کہیں وہ مفہوم بیان کرتا کرتا اردو ہی غلط نہ لکھ جائے اور اس طرح کوئی اور مسئلہ بن جائے اردو کی بات آتی ہے تو جناب ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ ہمیں ''ایٹم'' کہنے سے روکتے ہیں اور جوہر کہتے ہیں اور جوہر سے پھر جوہری بنا لیتے ہیں ۔ پھر جوہری توانائی آ جاتی ہے ۔ ایٹم کہنے کی آپ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں ۔ لیکن جب ہم ''ایٹم'' سے ''ایٹمی'' کہتے ہیں تو ہمارے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں ''ایٹمی'' کے ساتھ جب ''قوت'' کا لفظ لگاتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ انگریزی کے لفظ کے ساتھ اردو کا لفظ کیوں آیا ۔ میرا کہنے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کی اردو کے سامنے سر تسلیم خم لیکن تھوڑی سی فراخدلی سے کام لیجیے اور اگر اس فراخدلی سے کام نہیں لیا جائے گا تو صورت حال غالباً زیادہ دیر تک ٹھیک نہیں ہوسکتی ۔ مجھے ایک کالج میں جانے کا اتفاق ہوا ۔ یہاں سائنس اردو میں پڑھائی جاتی ہے وہاں ہر طالب علم اردو میں سائنس پڑھنے کے بعد بھی انگریزی کتابوں کا سہارا لیتا ہے ۔ آخر ایسا کیوں ہے ؟ اس لیے کہ بہتر اصطلاحات نہیں بن رہیں جو مفہوم ادا کریں ۔ میری تجویز ہے کہ پرانی اصطلاحات میں مزید اصلاح کی جائے اور نئی اصطلاحات پیدا کی جائیں کسی نئے ادارے کو قائم کرنے کی بجائے مقتدرہ قومی زبان اور اردو سائنس بورڈ کو اس میں مدد کرنی چاہیے اور اصطلاحات میں اضافہ کرنا چاہیے ترجمہ شدہ کتابیں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ، یہ ابھی معیاری نہیں ہیں ۔ اس کی کیا وجوہات ہیں ، یہ بھی پوچھنا ہے اس میں زبان کے ساتھ اصطلاحات کا مسئلہ بھی آتا ہے ۔ صورتحال یہ ہے کہ اگر بائیو ٹیکنالوجی میں کوئی کتاب اردو میں تلاش

کرنا چاہیں ۔ تو پشاور سے لیکر کراچی تک چلے جائیں ، کتاب آپ کو اردو میں نہیں ملے گی ۔ لیکن اس ساری صورت حال کے باوجود بھی اشفاق احمد صاحب جو خدمات انجام دے رہے ہیں ، میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ یہ کام تیزی سے آگے بڑھے گا۔ جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے ۔ جنھوں نے ان کتابوں کو لکھنا ہے۔ میں نے ابھی افرادی قوت کی بات کی تھی ۔ یہ بھی ہمارے پوچھنے کی بات ہے کہ اگر ہم اردو کو ذریعہ تعلیم چاہتے ہیں ۔ تو ہمارے ہاں کتنے آدمی ہیں جو سائنس کے اس شعبہ میں کتابیں لکھ سکتے ہیں اور پھر کتنے ہیں جنھوں نے لکھی ہیں یا لکھ رہے ہیں اور پھر کتنے ہیں جن کی کتابیں ہیں جو چل نکلی ہیں اور وہ مستند مانی جاتی ہیں ، قلیل سی تعداد ہے لوگ کیوں اس طرف نہیں آ رہے ، کیا قوت ارادی کی کمی ہے ، پیسے کی کمی ہے یا کوئی اور مشکلات ہیں ۔ ان تمام مسائل کا حل ہمیں تلاش کرنا ہوگا ۔

میں نے یہ دیکھا ہے کہ کتاب لکھوانی ہو ، میں نے لکھوانے پر زور دیا ہے کیونکہ لکھنے پر بہت کم لوگ آمادہ ہوتے ہیں ۔ اثرو رسوخ کو مزید استعمال کیا جاتا ہے ۔ انعامات دیتے جائیں، تاکہ مزید حوصلہ افزائی ہو سکے ۔ ایک اور کمی بھی ہے وہ یہ کہ ہمارے اساتذہ جو سائنس پڑھاتے ہیں ۔ ان کو ترجمے کی ٹریننگ نہیں دی گئی اور نہ ہی ترجمے کے اصول بتائے گئے ہیں ۔ میں امید کرتا ہوں کہ مقتدرہ قومی زبان نے دارالترجمہ کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے ۔ اس کو مزید وسعت دے کر اس میں اساتذہ کو بلاکر ان کو ٹریننگ دے اور ریفریشر کورسز کروائے جائیں اور ان کو ترجمہ کرنے کے اصول بتائے جائیں اس طرح کرنے سے شاید لکھنے والوں میں اضافہ ہو سکے ۔

بلال احمد صاحب :

جب تک اردو ذریعہ تعلیم نہیں بنتی ۔ اس وقت تک ترجمے کا سائنسی ادارے ہی کچھ کریں گے ۔ جب تک کہ آپ اردو کو تعلیم کا ذریعہ نہیں بنائیں گے ۔ یہ کام کسی ادارے کو ہی کرنا پڑے گا کہ وہ کتابیں چھاپے اور جب اردو میڈیا بن جائے گا ۔ تو پھر سب ادارے

آئیں گے کتابیں چھاپنے کے لیے - جب تک کوئی اور ادارہ وجود میں نہیں آتا میرا خیال ہے کہ یہ کام بہتر طور پر مقتدرہ قومی زبان ادا کر سکتا ہے -

ڈاکٹر رفیق احمد :

آج محفل میں جو باتیں ہوئی ہیں ان کی دو فریکونسی، میں ایک میڈیم فریکونسی اور دوسری شارٹ فریکونسی، پہلی نشست کے صدر جناب ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب نے بڑا بلیغ خطبہ ارشاد کیا - جس زمانے میں میں طالب علم تھا اس زمانے میں میرا تعلق نوائے وقت اخبار کے شعبہ ترجمہ سے تھا - سوال یہ ہے کہ ترجمے کے مسائل میں اہم مسئلہ کیا ہے - میرے نزدیک اصل مسئلہ علوم و فنون کو قومی زبان میں منتقل کا ہے میں جس زمانے میں بہاولپور میں تھا تو ترجمہ کی اہمیت کے پیش نظر میں نے وہاں ایک ادارہ قائم کر دیا تھا اب مسئلہ یہ ہے کہ دوسروں کے افکار و احساسات سے واقفیت حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے باقی حصوں میں کس قسم کا ادب تخلیق ہو رہا ہے - دوسرا مسئلہ دوسروں کی علمی ترقی سے آگاہی حاصل کرنا ہے - میں اس سے متفق ہوں - علوم کی تیز رفتار ترقی میں ہماری پیش رفت بہت سست ہے - نئے علوم سے واقفیت بہت ضروری ہے - تاکہ ہم سائنس پڑھانے والے نہ بنیں بلکہ سائنس دان بنیں - میری رائے میں اصل مسئلہ بھی یہی ہے تراجم کے میدان میں تین قسم کے تراجم ہیں اور یہ تین قسم کی کتابیں دوسروں کے خیالات و افکار پر مبنی ہیں - ایک تو وہ جو ذاتی اثرات کے تحت تراجم ہوئے ہیں مثلاً علامہ اقبال ہیں اور دوسرے شعرا ہیں تو ان کے تراجم ذاتی طور پر کیے گئے - دوسرے تراجم کاروباری ضرورت کے تحت ہوتے ہیں - کاروباری ضروریات کے مطابق تراجم بے شک اچھے ہیں اور طلبہ کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں - تیسری قسم کے تراجم وہ ہیں، جو اداروں کے تحت ہوتے ہیں - مقتدرہ قومی زبان ہے، اردو سائنس بورڈ ہے - نکسن کے قول کے مطابق کسی قوم کی ترقی، وسائل، افرادی قوت اور قوت ارادی میں ہے اگر قوت ارادی کی جگہ مقتدرہ قومی زبان کو اور اردو سائنس کانفرنس کو شامل کر دیا جائے تو شاید بات پوری ہو سکے - یہ تین قسم کے تراجم اور بہت سی دوسری کتابیں جو لوگوں نے خود لکھی ہیں لیکن دونوں قسم

کا سرمایہ بھی بہت کم ہے - اس وقت ہم علوم و فنون کو منتقل کرنے کے سلسلے میں ایک بحران سی کیفیت کا شکار ہیں - اس بحران کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب آپ کوئی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کریں یا باہر سے لوگ آتے ہیں یا باہر سے بے شمار کتابیں آتی ہیں تو ان کو پڑھ کر آپ یہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں - اب انگریزی اصطلاح کا مسئلہ ہے یہ مسئلہ کہ آپ اس کا ترجمہ کریں یا اسے اسی طرح قبول کر لیں اردو کو کس طرح ترقی حاصل ہو - اردو کا لفظ خود بتاتا ہے کہ لشکری زبان ہے - اردو نے بہت سے شعرا اور ادیب پیدا کیے جنھوں نے اسی زبان کو ترقی کی منزلیں عطا کیں - پاکستان میں ایک زبان وہ ہے جو علمی اور ادبی محفلوں میں بولی جاتی ہے اور ایک زبان وہ ہے جو گلیوں اور بازاروں میں اور عوامی سطح پر بولی جاتی ہے زبان جو عام سطح پر بولی جاتی ہے اس کو دوام ہوتا ہے اس کے علاوہ مسئلہ معیاری کتابوں کی کمی کا بھی ہے یہ سارے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں - اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہماری جو تعلیمی بنیاد کمزور ہے میری رائے میں ۹ یا ۱۰ % سے زیادہ خواندگی نہیں ہے پاکستان میں ۲۶ % میں وہ لوگ آ جاتے ہیں جو تھوڑا بہت گنتی کرنا اور لکھنا جانتے ہوں - اگر آپ پرائمری کو لیول بنائیں اب تک پرائمری میں جن بچوں نے تعلیم حاصل کی ہے ان کی تعداد ۹ یا ۱۰ % تک بنتی ہے یہ خواندگی کا معیار ہے - آپ علم اور تراجم کی بات کرتے ہیں - قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ وسیع پیمانے پر افکار کی تحریکیں جاری نہ ہوں - علوم و فنون کی منتقلی پر بہت زور ہونا چاہیے - ہمارے جو سائنسدان ہیں جو سماجی علوم کے ماہرین ہیں زیادہ بہتر راستہ یہ ہو گا کہ وہ انگریزی علوم کی کتابیں زیادہ پڑھیں اور اپنی زبان میں اس کے تراجم کریں اکنامکس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات ہیں جاپان کو جرمنی اکنامکس پر جرمن کا ایک رسالہ آتا ہے اس طریقے پر جاپان نے بھی ٹوکیو یونیورسٹی سے جاری کیا ہے مغربی ممالک مشرقی ممالک سے جو معلومات حاصل کرتے ہیں اس کی تھوڑی سی تفصیل اس رسالے میں شائع کر دیتے ہیں اور جو اپنے افکار ہیں اس کو انگریزی میں منتقل کرتے ہیں اسی طریقے سے وہ ایک ان پٹ اور اوٹ پٹ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے میری

راے میں تراجم کے لیے مستند اصطلاحیں بنائیں ۔ ہمارے ہاں اس کام کی اتنی کمی ہے کہ ہر کام میں جس جگہ بھی اور جس شکل میں بھی ہو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے ۔ اس معاملے میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا تعاون بہت ضروری ہے ۔

ایک بات جو سب سے زیادہ ضروری اور نہایت اہم ہے آپ ترجمہ کریں اور ترجمہ کرتے ہوئے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کریں ۔ لیکن ان لوگوں کی شرکت کے بغیر جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں درس و تدریس میں حصہ لے رہے ہیں سائنسی و تکنیکی علوم کو اردو میں نہ تو کامیابی سے منتقل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے طلبا کو موثر انداز میں علوم کو منتقل کرنے میں مدد مل سکتی ہے اس لیے ان اساتذہ کی مناسب تربیت اور ان کا ترجمہ میں شرکت ضروری ہے اگر مقتدرہ کوئی ایسا کام کرے جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ کو بھی شریک کیا جائے تو پنجاب یونیورسٹی میزبانی کے فرائض سر انجام دینے کو تیار ہے اور اس کے تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے ۔

میں آخر میں مقتدرہ اور خواتین و حضرات آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑے تحمل سے بحث میں حصہ لیا اور قابل قدر مشورے دیے ۔

تیسری نشست

دفتری اور قانونی تراجم کے مسائل

rekhta

صدارت	اشفاق احمد
مہمان خصوصی	قدرت اللہ شہاب
دفتری اصطلاحات و مراسلات کے تراجم۔ مسائل اور مشکلات	پروفیسر نیاز عرفان (مقالہ) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (تبصرہ)
قانونی اصطلاحات و دستاویزات کے تراجم۔ مسائل اور مشکلات	ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی (مقالہ)
گفتگو (بحث تیسری نشست)	ڈاکٹر انور محمود خالد

دفتری اصطلاحات و مراسلت کے تراجم کے مسائل و مشکلات

پروفیسر نیاز عرفان

موضوع زیر بحث پر گفتگو کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک قابل افسوس امر کی طرف توجہ دلائی جائے وہ یہ ہے کہ ہم انگریزی اور یورپی زبانوں کی اصطلاحات کے اردو تراجم کا تو ذکر کرتے ہیں ۔ لیکن اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں غیر ملکی حکومت کے آنے اور ان کا دفتری نظام قائم ہونے سے پیشتر بھی یہاں نظام حکومت موجود تھا - دفاتر بھی تھے اور ان دفاتر میں مغلیہ دور میں فارسی اور انگریزوں کے دور حکومت میں ۱۸۳۶ء کے بعد اردو میں کام ہوتا تھا ۔ پھر حیدر آباد دکن کے دفاتر اور تعلیمی اداروں میں بھارتی قبضے تک پورا کام اردو ہی میں ہوتا تھا ۔ لہٰذا بے شمار اصطلاحات ہمارے پاس پہلے سے موجود ہیں ۔ اس طرح ہمارا کام انگریزی اصطلاحات کے تراجم ہی نہیں بلکہ پہلے سے موجود اصطلاحات کو دوبارہ رائج کرنا بھی ہے ۔ ہو سکتا ہے اب وہ اصطلاحات مانوس نہ رہی ہوں - لیکن ضروری نہیں کہ نامانوس اصطلاحات مشکل بھی ہوں ۔

اب آئیے اصل موضوع کی طرف پہلا سوال یہ ہے کہ دفتری اصطلاحات و مراسلت کے تراجم کے سلسلے میں ہمیں کس قسم کے مسائل و مشکلات درپیش ہیں ۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے - گو بعض حضرات یہی کہتے ہیں کہ اردو کا دامن تنگ ہے اور اس میں انگریزی زبان کی تمام اصطلاحات کے ترجمے کی اہلیت و صلاحیت موجود نہیں ہے - حقیقت یہ ہے کہ اردو کا دامن تنگ نہیں ، اگر تنگ ہے تو ان کا زاویہ

لگا ۔ ۱۸۳۶ء کے بعد انگریزوں نے دفتری نظام میں زبان اردو کو آزمایا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض محکموں مثلاً محکمہ مال ، محکمہ پولیس وغیرہ میں آج تک بیشتر دفتری کام اردو میں ہو رہا ہے ۔ حیدر آباد دکن میں کامیابی کے ساتھ اردو بطور دفتری اور تدریسی زبان استعمال کرکے اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا ۔

گو ہم دفتری اصطلاحات اور مراسلات کے اردو تراجم کے مسائل و مشکلات کا ذکر کر رہے ہیں ۔ لیکن یہ مسائل نہ تو لاینحل ہیں اور نہ ہی یہ اردو کے نفاذ کی راہ میں حائل ہیں ۔ جو بھی مسائل و مشکلات نظر آتی ہیں وہ اس تعطل کا نتیجہ ہیں جو دفتری اور تعلیمی اداروں میں اردو کے بطور سرکاری زبان کے استعمال میں واقع ہوا ۔ دفتروں اور تعلیمی اداروں سے تقریباً ایک صدی تک بے دخل رہنے کے بعد لوگوں کو اردو کی اصطلاحات میں مغائرت اور اجنبیت نظر آنے لگی جب کہ کچھ تو حاکموں کی زبان کے رعب و دبدبے کی وجہ سے اور کچھ احساس کمتری کے نتیجے کے سبب لوگ انگریزی زبان میں کام کرنے کو باعث فخر سمجھنے لگے ۔ گو اس غیر ملکی زبان میں ان کی مہارت اپنی زبان کے مقابلے میں صفر کے برابر تھی ۔ چنانچہ قومی زبان کو دفتری زبان کے طور پر اختیار کرنے میں تذبذب اور پس و پیش اسی ذہنی کیفیت کا نتیجہ ہے ۔ اسی قسم کے حضرات کا اصرار و تقاضا ہے کہ اول تو ملک میں انگریزی ہی کو دفتری زبان رہنے دیا جائے اور اگر قومی زبان کو اپنایا بھی جائے تو اصطلاحات کے ترجمے نہ کیے جائیں ۔ کہ اس طرح ہم بین الاقوامی رابطے سے محروم ہو جائیں گے اور پھر ان کے خیال میں اردو میں مناسب ترجموں کی صلاحیت بھی نہیں ہے ۔ لہٰذا وہ انگریزی ناموں اور اصطلاحات کو بعینہٖ اردو حروف میں لکھنے پر اصرار کرتے رہے ہیں یا پھر وہ انگریزی اصطلاحات کے اپنی صوابدید کے مطابق اصطلاحات کے ترجمے کرتے رہے ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی انگریزی نام کے رنگا رنگ ترجمے ملتے ہیں ۔ مثال کے طور پر Board of Intermediate and Secondary Education. کو لے لیجیے مختلف بورڈوں نے اس کے جو اردو مترادفات اختیار کرکے رائج کیے وہ یہ ہیں :

۱ ۔ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن ۔

۲ ۔ انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ ۔

۳ ۔ انٹرمیڈیٹ و سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ ۔

۴ ۔ انٹرمیڈیٹ و ثانوی ایجوکیشن بورڈ ۔

۵ ۔ انٹرمیڈیٹ و ثانوی تعلیمی بورڈ ۔

۶ ۔ ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ ۔

۷ ۔ اعلیٰ ثانوی و ثانوی تعلیمی بورڈ ۔

۸ ۔ اعلیٰ و ثانوی تعلیمی بورڈ ۔

۹ ۔ مجلس انٹرمیڈیٹ و ثانوی تعلیم ۔

۱۰ ۔ انٹرمیڈیٹ و ثانوی تعلیم مجلس ۔

۱۱ ۔ متوسط و ثانوی تعلیمی بورڈ ۔

ایک انگریزی نام کے اردو میں اتنے مترادفات اس بات کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں کہ انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کے کام کو ہر شخص کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا ۔ کیونکہ اس سے زبان میں انتشار پیدا ہونے کا احتمال ہے ۔ دوسرے یہ کہ وضع اصطلاحات اور استناد اصطلاحات کا کام صرف مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام ہونا چاہیے اور اختلاف کی صورت میں صرف وہ اصطلاح رائج کی جائے جس کا استناد مقتدرہ قومی زبان نے کیا ہو :

Board of Intermediate & Secondary Education کے ترجمے کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان کی مجلس استناد نے گیارھویں نمبر پر درج یعنی متوسط و ثانوی تعلیمی بورڈ کو منظور کیا ہے ۔ جب بورڈ کے ترجمے پر غور ہو رہا تھا ۔ تو یہ مشکل سامنے آ رہی تھی کہ کمیٹی بورڈ ، سینٹ ، اسمبلی اور گیدرنگ (gathering) کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں ایک ہی لفظ مجلس سے کیا جاتا ہے ۔ جب کہ ایک خاص قسم کے مذہبی اجتماع کو بھی مجلس کہتے ہیں ۔ مسئلہ یہ در پیش تھا کہ ترجمے میں ان تصورات کے فرق کو کیسے واضح کیا جائے ؟ بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ کمیٹی اور بورڈ کے الفاظ کو اردو میں قبول کر لیا جائے Board of Intermediate & Secondary Education کا ترجمہ متوسط

و ثانوی تعلیمی بورڈ اختیار کرنے کے بعد بورڈوں ہی سے متعلق ایک اور ادارے "Inter Board Committee of Chairmen" کے انگریزی نام کے اردو میں ترجمے کا مسئلہ درپیش ہے اس کے درج ذیل چھ ترجمے کیے جا سکتے ہیں :

۱ - بین المجالس مجلس صدر نشیناں ۔
۲ - بین المجالس صدر نشیناں کمیٹی ۔
۳ - بین المجالس کمیٹی ، صدر نشیناں ۔
۴ - بورڈوں کے صدر نشینوں کی کمیٹی ۔
۵ - رابطہ کمیٹی صدر نشیناں بورڈ یا بورڈاں ۔
۶ - بین بورڈ یا بین البورڈ کمیٹی صدر نشیناں ۔

ان میں پہلے تین ترجمے اس لیے مسترد ہو جائیں گے کہ ہم نے بورڈ کے لفظ کو اردو میں قبول کر لیا ہے ۔ لٰہذا اسے ہر شکل میں قائم رہنا چاہیے ۔ نمبر شمار ۴ اور ۵ پر درج ترجمے بے ڈھنگے ہیں لٰہذا انھیں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ لٰہذا بین بورڈ یا بین البورڈ کمیٹی صدر نشیناں ہی موزوں ترین ترجمہ معلوم ہوتا ہے ۔ ہو سکتا ہے بعض حضرات اس ترجمے پر ناک بھوں چڑھائیں ۔ راقم الحروف کا موقف یہ ہے کہ جب ہم انگریزی یا کسی دوسری زبان کی کسی اصطلاح کو اردو میں بعینہٖ یا توزید کے عمل کے ذریعے شامل کر لیں تو پھر اضافت وغیرہ کے استعمال کے سلسلے میں اس کے ساتھ عربی الاصل یا فارسی الاصل الفاظ کے مقابلے میں امتیازی سلوک نہیں برتنا چاہیے ۔ بدقسمتی سے اب تک غیر عربی اور غیر فارسی الفاظ کے معاملے میں ہمارا رویہ امتیازی رہا ہے ۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے ہم کسی غیر مسلم کو دائرہ اسلام میں شامل کر لینے کے باوجود اسے اسلامی معاشرے کا فرد نہ بنائیں اور اس کے ساتھ چھوت چھات کا برتاؤ کرتے رہیں ۔ اس کے ساتھ رشتے ناطے سے اجتناب برتیں ۔ اس رویے کو ہم سب غلط قرار دیتے ہیں تو پھر غیر عربی و غیر فارسی الفاظ کے معاملے میں بھی ہمارا رویہ صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اب تک اس امتیازی سلوک کے نتیجے کے طور پر ایک تو اردو کا دامن تنگ

ہو گیا ہے ، دوسرے وضع اصطلاحات کے سلسلے میں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ جہاں انگریزی اور یورپی زبانوں کے رسیا لوگوں کی تنگ نظری قابل افسوس ہے ۔ وہیں پاکستان بن جانے کے بعد ماہرین لسانیات کے اس اصرار نے اردو کو کافی نقصان پہنچایا ہے کہ عربی و فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں حتیٰ کہ پاکستان کی صوبائی زبانوں کے الفاظ کو بھی اردو میں شامل کرنے کے باوجود ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ۔ راقم الحروف کی ناچیز رائے میں اب وقت آ گیا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان کے پلیٹ فارم سے یہ انقلابی فیصلہ کیا جائے کہ ہر اردو لفظ پر خواہ اس کا ماخذ کوئی زبان بھی ہو اردو گرامر کے ہر قاعدے اور اصول کا یکساں طور پر اطلاق کیا جائے گا ۔ اس قاعدے کی بنا پر Inter Board Committee of Chairmen کا ترجمہ بین البورڈ کمیٹی صدر نشیناں کیا جانا چاہیے کیونکہ اصطلاح کے تمام اجزا اردو کے الفاظ ہیں آپ چاہیں تو بین البورڈ کی بجائے بین البورد کہہ لیجیے ۔ اور کمیٹی کو کمیتی کہہ لیجیے جب "لب سڑک" کی ترکیب کو سند قبولیت مل چکی ہے گو غلط العام کے گمراہ کن نام سے ہی سہی ۔ تو آواز ڈھول ، ارکان بورڈ خانہ ہائے یا کالم ہائے ہل کی تراکیب میں کیا قباحت ہے ؟ زبان کے معاملے میں اہل ایران اور اہل عرب ہم سے زیادہ جرات مند اور وسیع القلب ہیں ۔ اگر عربی یا فارسی میں کسی غیر ملکی اصطلاح یا لفظ کا موزوں مترادف نہیں ملتا تو وہاں اس اصطلاح کو معرب یا مفرس کرکے شامل زبان کر لیا جاتا ہے اور اس اصطلاح پر گرامر کے وہ تمام قاعدے لاگو کیے جاتے ہیں جو عربی یا فارسی الفاظ پر لاگو ہوتے ہیں ہم اس معاملے میں کافی پیچھے ہیں ۔ حالانکہ اردو میں اس طریق کار پر عمل کرنے کی زیادہ ضرورت ہے ۔

تراجم کے سلسلے میں ایک اور مسئلے کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ وہ یہ ہے کہ پاکستان بننے سے پیشتر بھی اور پاکستان بن جانے کے بعد بھی کئی علمی و سائنسی کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں ۔ کئی ایک اداروں نے لغتیں بھی شائع کی ہیں ۔ ان میں بعض اصطلاحات اور الفاظ کے تراجم مختلف کیے گئے ہیں ۔ جس کی ایک مثال تو شروع ہی میں دی جا چکی ہے ۔ مزید مثالیں یہ ہیں :

Experiment کا ترجمہ کراچی میں اختیار کیا جاتا ہے جب کہ پنجاب میں تجربہ کیا جاتا ہے Secretariat کا ترجمہ بعض لغتوں میں معتمدیہ کیا گیا ہے اور بعض میں دیوان حکومت Controller of Examination کا ترجمہ بعض جگہ ناظم امتحانات کیا جاتا ہے - بعض جگہ افسر مختار امتحانات اور بعض جگہ نگران کار امتحانات ترجموں کی ان صورتوں میں یکسانیت نہایت ضروری ہے اور ترجمے کی ان کوششوں میں یکسانیت لانے کے لیے مناسب ہی ہوگا کہ ایسے تمام تراجم کا استناد مقتدرہ قومی زبان میں کیا جائے -

اس سلسلے میں تجویز پیش کی جاتی ہے کہ مجلس استناد میں متعلقہ اداروں کے ان ماہرین ترجمہ اور لغت نویسوں کو بھی شامل کیا جائے ، جنھوں نے وہ ترجمے کیے ہوں تاکہ ان سب کا موقف مکمل غور و خوض اور آپس میں تبادلہ خیالات کے بعد استناد کیا جائے -

دفتری اصطلاحات کے مسائل کے ضمن میں اردو کے لفظ ''کیفیت'' کے استعمال پر غور کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے - آپ جانتے ہیں کہ کئی انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کے ترجمے میں ''کیفیت'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے - مثلاً Remarks کا ترجمہ ''کیفیت'' کیا جاتا ہے - Noting کا ترجمہ ''کیفیت نویسی'' کیا جاتا ہے - جب کہ انگریزی لفظ Quality کا ترجمہ بھی ''کیفیت'' کیا جاتا ہے اور بعض اوقات لفظ State کا ترجمہ بھی کیفیت کیا جاتا ہے - اگر ہم ''ایک اصطلاح کا ایک ترجمہ'' کے اصول کو مدنظر رکھیں تو تراجم کی اس صورت حال کو ختم کرنے کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے - خوش قسمتی سے لفظ Remarks کا ترجمہ اب ''کیفیت'' کی بجائے ''تصریحات'' کیا جانے لگا ہے - لہٰذا اسی کو رائج کیا جانا چاہیے - آپ جانتے ہیں کہ Noting سے دراصل Note-writing کا عمل مراد ہے - ہم Note کا ترجمہ تو اشارہ کرتے ہیں لیکن Noting کا ترجمہ ''کیفیت نویسی'' کرتے ہیں - کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ Note کا ترجمہ ''شرح'' کیا جائے اور Noting کا ترجمہ شرح نویسی کریں -

یہاں بر سبیل تذکرہ File اور Filing کی اصطلاحات کے ترجموں کے بارے میں چند کلمات کہنا چاہتا ہوں - File کا ترجمہ تو مدت سے

''مسل'' کیا جا رہا ہے اور یہ رائج بھی ہو چکا ہے - Filing کی اصطلاح کا ترجمہ کتاب ''دفتری اردو'' کے مصنف جناب ڈاکٹر صدیق شبلی نے ''مسلداری'' کیا ہے - لیکن Filing سے مراد مسلیں رکھنا یا سنبھالنا نہیں بلکہ کاغذات ، مراسلات و دستاویزات کو داخل مسل کر کے ان پر صفحات لکھنا ہے - اب چونکہ (Ing) پر ختم ہونے والی انگریزی اصطلاحات کے ترجمے میں ''کاری'' کا لاحقہ استعمال کیا جاتا ہے - مثلاً Marketing کا ترجمہ ''بازار کاری'' لہٰذا یہ مناسب ہو گا کہ Filing کا ترجمہ ''مسل کاری'' کیا جائے -

یہ بات تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان بن جانے کے بعد قومی زبان کے ارتقا میں پاکستانی زبانوں کو بہت اہم کردار ادا کرنا ہے مگر افسوس ہے کہ اس معاملے میں اب تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی - انگریزی اصطلاحات کے تراجم کے سلسلے میں بعض ایسی مثالیں بھی ہیں کہ جب عربی ، فارسی یا ہندی میں کوئی موزوں لفظ نہیں ملتا تو ہماری مشکل کو پاکستان کی کوئی صوبائی زبان حل کر دیتی ہے - مثلاً انگریزی کی ایک اصطلاح Thinning یہ باڑیا فصل کے سلسلے میں اولی جاتی ہے اس کے لیے اردو میں کوئی موزوں لفظ نہ ملا تو پنجاب کی صوبائی مجلس زبان دفتری کے لغت نویسوں نے بجا طور پر پنجابی زبان کا لفظ چھدرائی اردو کے ذخیرہ الفاظ میں شامل کر لیا - Thinning کے ترجمے کے لیے اس سے بہتر لفظ ملنا ممکن نہ تھا - اس طرح آج کل پنجابی لفظ '' جوگا '' بمعنی ''کے قابل ہونا'' کو بھی اردو میں استعمال کیا جا رہا ہے ایسے اور دیگر ایسے الفاظ کو بھی اردو کے ذخیرہ الفاظ میں شامل کیا جا سکتا ہے -

دفتری اصطلاحات کے تراجم کی بہت سی مشکلات کا حل اسی میں مضمر ہے کہ پاکستانی زبانوں پنجابی ، سندھی ، پشتو ، بلوچی ، براہوی ، کشمیری ، سرائیکی ، پوٹھوہاری اور ہندکو سے ایسے الفاظ جمع کیے جائیں جو بعض انگریزی یا بین الاقوامی اصطلاحات کے مترادف کے طور پر کسی دیگر زبان کے الفاظ کے مقابلے میں موزوں ترین سمجھے جائیں اور مقتدرہ قومی زبان کی مجلس استناد ان کا استناد کر کے قومی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں کرے - اس طرح متذکرہ بالا زبانیں اور قومی زبان ایک دوسرے کے

ذخیرہ الفاظ سے استفادہ کر سکتی ہیں ۔ اس عمل سے جہاں قومی زبان کے ارتقا کا عمل تیز ہو گا وہیں صوبائی اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا ۔ جس سے قومی یک جہتی کو بھی فروغ حاصل ہو گا ۔

بہت سے انگریزی اور یورپی زبانوں کے الفاظ پہلے ہی اردو کے ذخیرہ الفاظ میں شامل ہو چکے ہیں ۔ مثلاً سٹیشن ، پالش ، بوٹ ، لالٹین ، جرنیل کرنیل ، کپتان وغیرہ ، اب غیر زبانوں کے الفاظ شمار نہیں کیے جاتے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مناسب احتیاط کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہے ، انگریزی اور یورپی زبانوں کی ایسی اصطلاحات جن کے لیے اردو میں یا عربی ، فارسی پاکستان کی کسی صوبائی و علاقائی زبان یا ہندی میں کوئی موزوں مترادف موجود نہ ہوں یا مترادف تو موجود ہوں مگر وہ انگریزی اصطلاح کے مقابلے میں طویل یا لکھنے یا بولنے میں مشکل ہوں یا جن کے بوجہ مغائرت رائج ہونے کے امکانات بہت کم ہوں ان انگریزی اصطلاحات کو اپنی اصل شکل میں یا مناسب تبدیلی کے ساتھ اپنا لیا جائے ۔ مثلاً انگریزی لفظ Form کے معنوں میں مقررہ خانوں والا ورقہ ، صورت اور بنانا مسائل ہیں جہاں تک پہلے معنے کا تعلق ہے اس کے لیے اردو میں لفظ ورقہ تجویز کیا گیا ہے لیکن ورق یا ورق خالی کاغذ کا بھی ہو سکتا ہے ۔ اس لیے اس معنی میں لفظ فارم کو اردو میں شامل کر لینا چاہیے ۔ اسی طرح دیگر انگریزی الفاظ و اصطلاحات جنہیں اردو میں شامل کیا جا سکتا ہے یہ ہیں :

بل (Bill) بمقابلہ بر آورد ، ایکٹ (Act) بمقابلہ قانون ، کیونکہ قانون (Law) کا ترجمہ بھی ہے ۔ سیل (Cell) بمقابلہ خانہ الارم (Alarm) بمقابلہ انتباہی گھنٹی ، کرنسی (Currency) بمقابلہ زر کیونکہ (Money) اور (Gold) کا ترجمہ بھی زر کیا جاتا ہے ۔

بعض انگریزی اصطلاحات کے معنوں میں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن اردو میں ان کا ترجمہ ایک ہی لفظ سے کیا جاتا ہے ۔ مثلاً Plan اور Scheme کا ترجمہ عموماً لفظ منصوبہ سے کیا جاتا ہے حالانکہ ان کا مفہوم الگ الگ ہے ۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ Project کا ترجمہ منصوبہ کیا جاتا ۔ پلان بصورت پلان اور سکیم کے الفاظ اردو

میں شامل کر لیے جائے جیسا کہ یہ بعض اوقات استعمال کیے بھی جاتے ہیں لیکن Plan کے لیے منصوبہ کا لفظ رائج ہو چکا ہے اور شاید اب اسے تبدیل کرنا ممکن نہ ہو ۔ لہٰذا Plan کا ترجمہ منصوبہ ہی کیا جائے اور پراجیکٹ اور سکیم کے الفاظ کو اردو میں شامل کر لیا جائے ۔ یاد رہے سکیم کے لفظ کا دوسرا ترجمہ تجویز کیا جاتا ہے جبکہ Proposal اور Suggestion کا ترجمہ بھی تجویز کے لفظ سے کیا جاتا ہے ۔

انگریزی کی ایک اصطلاح Charge بمعنی عہدے کا Charge ہے جس سے ایک دوسری اصطلاح Incharge بنائی گئی ہے ۔ Charge کی اصطلاح برقیات میں بھی مستعمل ہے جس کا اردو ترجمہ بار کیا جاتا ہے ۔ نیز یہ قانون کی اصطلاح بھی ہے ۔ یہاں اس کا ترجمہ الزام کیا جاتا ہے عہدے کے Charge کے معنوں میں اردو میں اس کا صحیح مترادف تحویل ہے ۔ لیکن پنجاب کی صوبائی مجلس زبان دفتری کی لغت میں اس کا ترجمہ جائزہ کیا گیا اور Incharge کا ترجمہ جائزہ دار کیا گیا ہے ۔ جو کسی طرح بھی موزوں نہیں ۔ لہٰذا ان معنوں میں charge کا ترجمہ تحویل اور Incharge کا ترجمہ تحویل دار ہی کرنا چاہیے ۔

بعض حضرات رخصت ، رقوم اور مراعات وغیرہ کے سلسلے میں انگریزی کی اصطلاحات Approve، Sanction، Grant اور Allow کے معنوں میں امتیاز کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں ۔ عموماً ان کو ایک مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ مثلاً رخصت کی منظوری کے لیے بلاامتیاز کبھی Sanction کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے کبھی Grant کا کبھی allow کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی Approve کا یہ اشکال انگریزی اصطلاحات کے سلسلے ہی تو ہے ۔ اردو میں ان کے صحیح مترادفات کے سلسلے میں کبھی ابہام موجود نہیں ہے ۔ یہ بات ان اصطلاحات کی درج ذیل تشریح سے عیاں ہوتی ہے ۔

Grant سے مراد عطائیگی ، عطا ، عطا کرنا یا مرحمت کرنا ہے Sanction کا مطلب اجازت دینا ہے اور Approve کا مفہوم توثیق کرنا ہے ۔ اگر رخصت یا رقم بغیر استحقاق کے دی جائے تو اس کے لیے مرحمت کرنا یا grant کی اصطلاح موزوں ہوگی ۔ اگر رخصت یا رقم از روئے قواعد استحقاق کی بنیاد پر دی جائے تو اس کے لیے Sanction یا

منظوری کی اصطلاح درست ہوگی ۔ اگر رخصت کی منظوری کی تجویز کی ایک افسر نے پیش کی ہو اور منظوری اس سے اعلیٰ تر افسر کو دینی ہو تو یہ تجویز کردہ رخصت کی توثیق approved کہلائے گی ۔ رخصت کی منظوری کے بعد ملازم کو دفتر یا مقام ملازمت چھوڑنے کی اجازت allow دی جاتی ہے ۔

اسی طرح بعض اوقات دو انگریزی اصطلاحات Instructed اور Directed کے مفہوم میں بھی اشتباہ محسوس کیا جاتا ہے ۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے مفہوم کا فرق واضح ہو جائے گا ، Instruction ۔

ایسی مفصل ہدایات ہیں جو تعلیم کے ذریعے ذہن نشین کروائی جائیں ۔ جبکہ Direction ایسی مختصر ہدایات ہیں جن کی غرض و غایت تعمیل ہو ۔

شعبہ تعلیم سے متعلق پانچ انگریزی اصطلاحات کے ترجمے اکثر آپس میں گڈ مڈ کر دیے جاتے ہیں ۔ وہ اصطلاحات (1) Scheme of Studies (2) Curricula (3) Syllabus (4) Course (5) Text book ہیں ۔ عموماً ان کا ترجمہ نصاب کر دیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ان کے صحیح تراجم یوں ہیں Scheme of Studies کا ترجمہ منصوبہ تدریس ، Curricula کا ترجمہ درسیات ہے ، Syllabus کا ترجمہ نصاب ، Course کا ترجمہ لائحہ عمل مطالعہ ہو سکتا ہے ، تجویز ہے کہ کورس کے لفظ کو اردو میں شامل کر لیا جائے ۔ Text Book کا ترجمہ درسی کتاب ہے ۔

Commission کا ترجمہ ماموریہ (Foundation) کا ترجمہ مؤسسہ اور (Corporation) کا ترجمہ بلدیہ اور اجتماعیہ ہے لیکن بعض حضرات ان تراجم کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود انھیں اپنانے اور رائج کرنے میں تذبذب محسوس کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں یہ ترجمے مشکل ہیں ۔ اس لیے شاید انھیں قبولیت عامہ حاصل نہ ہو ۔ اگر اصل انگریزی اصطلاحات بولنے لکھنے میں مشکل نہ ہوتیں تو اردو میں انھیں رائج کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہوتا ، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے ۔ لہٰذا کیوں نہ ماموریہ ، مؤسسہ ، بلدیہ اور اجتماعیہ کے الفاظ کو قبول کر لیا جائے ۔ کچھ مدت کے لیے ہم یہ اہتمام کر سکتے ہیں ۔ جیسا کہ بعض ممالک بشمول

اسرائیل میں کیا گیا کہ اردو مترادفات کے ساتھ قوسین میں اصل انگریزی اصطلاحات کو لکھا جاتا رہے ۔ جب لوگ اردو مترادفات سے شناسا ہو جائیں تو انگریزی اصطلاحات کو لکھنا چھوڑ دیں ۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ مقتدرہ قومی زبان کے دفتر کی دارالحکومت میں منتقلی اور نئی قیادت کی دانشمندانہ حکمت عملی کے نتیجے کے طور پر نفاذ اردو کے بیشتر مسائل حل ہوچکے ہیں اور جو تھوڑے بہت مسائل باقی ہیں ۔ وہ بھی حل ہو جائیں گے صدرنشین مقتدرہ قومی زبان مجالس استناد کی کارروائی میں ذاتی دلچسپی لے کر ان مجالس کو ہر دم فعال رکھتے ہیں ۔ لہٰذا قوی امید ہے کہ انشا اللہ بہت جلد قومی زبان کو معاشرے میں اس کا جائز مقام حاصل ہو جائے گا اور یہ زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہو جائے گی ۔

دفتری اصطلاحات و مراسلت کے تراجم کے مسائل و مشکلات

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

یہ درست ہے کہ قیام پاکستان سے قبل دفتری اصطلاحات کا بہت سا کام اردو میں ہو چکا تھا ، لیکن ان اصطلاحات کو یا تو عربی زبان سے مستعار لیا گیا تھا یا قدیم فارسی سے استفادہ کیا گیا تھا ۔ اس زمانے میں تعلیم یافتہ طبقہ فارسی زبان کے مطالعے پر خصوصی توجہ دیتا تھا اور عربی اصطلاحات اجنبی معلوم نہیں ہوتی تھیں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ قیام پاکستان کے بعد انگریزی زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور فارسی زبان کی اہمیت کم ہوگئی ۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ اور دیگر علمی اداروں کی مرتب کردہ اصطلاحات مشکل اور غریب نظر آنے لگیں ۔ اردو زبان کا دامن ہرگز تنگ نہیں ، کمی لغت کی ہے ، کہ ہم نے ایسے متبادل الفاظ تلاش نہیں کیے جو عام فہم اور بامعنی اصطلاحات میں ڈھل سکیں نہ ہم نے اتنے حوصلے کا ثبوت دیا ہے کہ غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحات کو اصل شکل بھی قبول کرلیں حالانکہ وہ بول چال کی زبان میں اپنا مقام بنا بھی چکی ہیں ۔

زندہ زبان کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اور تراکیب کو (اپنے لہجے کے مطابق) اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اس لیے کسی احساس میں مبتلا ہوئے بغیر ہم بعض اصطلاحات کو اپنی زبان کا حصہ بنا سکتے ہیں یا ایسے مترادفات استعمال کر سکتے ہیں جو عوام میں مقبول ہو چکے ہوں مثلاً (پہلی مثال میں) ۔

"ثانوی اور اعلیٰ ثانوی بورڈ"

کی اصطلاح زبان زد عام ہے اب اسے متوسط و ثانوی بورڈ کا نام دینا زیادہ بہتر نہیں ۔ البتہ یہ بات سو فیصد درست ہے کہ انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کا کام ہر شخص کی صوابدید پر نہ چھوڑا جائے ، بلکہ کوئی ایک ہی ادارہ یا مقتدرہ قومی زبان ہو یا انجمن ترقی اردو اس ذمہ داری کو قبول کرے ۔ تاہم انفرادی کاوشوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ ایسی کاوشوں سے ادارے کو کسی نتیجے تک پہنچنے میں سہولت ہوگی ۔

Inter Board Committee of Chairmen کے چند ترجمے مجھے شبہ ہے کہ شاید ہی قبول عام کی سند حاصل کرسکیں ان تمام تراجم سے بہتر اصل عبارت ہے کہ وہ عام فہم اور قابل قبول ثابت ہوسکتی ہے ۔ البتہ قواعد کے معاملے میں مجھے جناب نیاز عرفان کے نظریے سے کلی اتفاق ہے ۔ عربی ، فارسی ، بلوچی ، سندھی ، پنجابی اور پشتو سے ہم بلا تکلف استفادہ کر سکتے ہیں ، لیکن انہیں خاص معاملے میں متبادل الفاظ کی تلاش ابھی جاری رہنی چاہیے تاآنکہ وہ متبادل ترجمہ قابل قبول نظر آنے لگے ۔

"بین البورڈ کمیٹی صدر نشیناں" ۔

میں انگریزی اصطلاح سے زیادہ مغائرت ہے ۔

جہاں ایک لفظ کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہوں وہاں مقتدرہ یا کسی دوسرے مجاز ادارے پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے کہ وہ صرف ایک مقبول مفید ، اور بامعنی ترجمے کو رائج کرنے کا حکم دے باقی ترجموں کو رد کردے مثلاً Experiment کا ترجمہ "تجربہ" زیادہ مقبول ہے اور بڑے حلقے میں رائج ہے ۔ اسی طرح Controller کا ترجمہ "ناظم" زیادہ بہتر سمجھا گیا ہے ۔ تاہم اگر ترجمے جامع نہ ہوں تو اصل لفظ کو رائج کرنے میں تکلف سے کام نہیں لینا چاہیے ۔

علاقائی زبانوں بلکہ صوبائی زبانوں کے سڈول الفاظ کو اردو کے ذخیرہ الفاظ میں شامل کرنا ہر اعتبار سے قابل تحسین کام ہے ۔ اس عمل سے رابطے کی زبان یعنی اردو کا رشتہ صوبائی زبانوں سے مضبوط ہوگا اور اردو زبان کی وسعت میں ہر اعتبار سے اضافہ ہوگا ۔ چنانچہ Thinning کا ترجمہ چھدرائی بالکل درست ہے Form ، Bill ، Act وغیرہ واقعی

اگر اسی طرح قبول کر لیے جائیں تو بہتر ہے ترجمے سے الجھن پیدا ہو سکتی ہے ۔

Project Plan اور Scheme کے سلسلے میں بھی جناب نیاز عرفان کا نقطہ نظر درست معلوم ہوتا ہے ۔ غیر زبانوں کے ایسے تمام الفاظ یا اصطلاحات جن کا ترجمہ ایک سے زیادہ الفاظ یا اصطلاحات میں ہو اپنی اصل صورت میں ہی استعمال ہونے چاہییں تاکہ معنی متعین رہیں ۔

Charge اور Incharge کے الفاظ اردو کا حصہ بن چکے ہیں ۔ خصوصاً انچارج کی اصطلاح مختلف اداروں میں لکھی اور بولی جاتی ہے ۔ علیٰ ہٰذ القیاس باقی الفاظ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے ۔

Commission Foundation اور Corporation میں سے ہر ایک کا مفہوم واضح ہے اور یہ اصطلاحات بآسانی اپنے اصل معانی میں قبول کی جاتی ہیں ان کا ترجمہ ماموریہ ، مؤسسہ وغیرہ قابل قبول نہ ہوگا خواہ ہم اصل اصطلاح قوسین میں کیوں نہ لکھیں ۔

یہ ضرور ہے کہ جب دفتر اردو میں ہو جائیں گے ۔ اپنی قومی زبان میں کام شروع ہو جائے گا تو خود بخود کچھ اصطلاحات زبان پر چڑھ جائیں گی اور چند رد کر دی جائیں گی ۔ جب پہلی بار ایف۔اے اور بی۔اے میں نصاب کو اردو میں پڑھایا جانے لگا ، تو Economics کا ترجمہ زیادہ تر مترجمین نے اقتصادیات کیا ۔ لیکن مقبولیت ''معاشیات''کو ملی حالانکہ علامہ اقبال نے اپنی کتاب کا عنوان ''علم الاقتصاد'' رکھا تھا قومی زبان کو ہر سطح پر رائج کرنا ضروری ہے اصطلاحات خود بخود زبان پر چڑھ جائیں گی ۔ یہ ضرور ہے کہ آخری فیصلے تک پہنچنے کے لیے کسی ایک ہی ادارہ سے رہنمائی حاصل کی جائے ۔

دفتری و قانونی اصطلاحات و دستاویزات کے اردو تراجم مسائل و مشکلات

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

وہ بھی کیا زمانہ تھا جب منشیان معجزرقم ، دفتروں کی زینت ہوا کرتے تھے اور ان کی تحریریں موتیوں میں تلتی تھیں ۔ اس منصب کے لیے مملکت بھر میں جوہر قابل کی تلاش ہوتی تھی ۔ پھر ان کی تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا ۔ قرآن و حدیث کے علاوہ عرب و عجم کی شاعری اور منطق و مناظرہ جیسے علوم ان کے نصاب میں شامل تھے ۔ کمال فن کو پہنچتے تو بادشاہ کی مصاحبت پاتے ۔ فارسی کی مشہور کتاب چہار مقالے کا موضوع یہی فن ہے ۔ چہار مقالے کی ایک روایت ہے کہ صاحب ابن عباد کے زمانے میں قم کا ایک قاضی بہت رشوت خور تھا ۔ لوگوں کی شکایتوں پر صاحب نے قاضی کو معزول کر دیا اور معزولی کا فرمان ان لفظوں میں تحریر کیا :

یا ایھا القاضی بقم ، قد عزلناک فقم

(اے قم کے قاضی ہم نے تجھے معزول کیا بس تو اٹھ کھڑا ہو)

یہ فرمان ، اپنی ادبی لطافتوں کے باعث ، مدتوں لوگوں کے ذہنوں پر نقش رہا ۔ اسی کتاب کی ایک دوسری روایت ہے کہ اہل لمغان نے خواجہ حسن میمندی سے مختلف حیلے بہانے کرکے دوبارہ اپنا خراج معاف کرا لیا تیسری بار آئے تو خواجہ نے ان کی درخواست مسترد کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا :

الخراج خرج اداوہٗ دواہ

(خراج ایک ناسور ہے جس کا در رہنا ہی اس کی دوا ہے)

خواجہ کا یہ جملہ بھی دفتری نگارشات میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

وہ زمانہ رہا نہ وہ دفتر اور دفتردار۔ اس زمانے میں دفتر اور اس کے کاروبار میں اتنا پھیلاؤ نہ تھا سر ارنسٹ انگلستان جیسے ملک کے دفاتر کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایک زمانے میں دفتری کاروبار اجلاسوں کی رودادوں، رپورٹوں یا سفیروں کو بھیجے جانے والے مراسلات تک محدود ہوا کرتا تھا۔

اس قسم کے محدود دفتر میں ان منشیوں اور ان کی نکتہ آفرینیوں کی گنجائش تھی لیکن اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ دفتر کے تقاضے بھی۔ پہلے رموز مملکت صرف خسرواں تک محدود تھے لیکن اب ان میں عوام کی شرکت بھی بڑھتی جا رہی ہے اور اب عوام بھی کالانعام نہیں رہے جو قانون ان کے لیے بنائے جاتے ہیں وہ انھیں جاننا چاہتے ہیں۔ قانون کے موثر نفاذ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کو اس کی غرض و غایت اور مضمرات سے آگاہ کیا جائے۔ قانون کی اشاعت کے لیے ابلاغ عامہ کا کوئی بھی ذریعہ استعمال کیا جائے اس میں زبان کی حیثیت بنیادی ہوگی اور جب تک قانون کے لیے سادہ زبان اختیار نہ کی جائے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے قانون اور دفتر دونوں کی زبان اور اصطلاحات کا سادہ اور عام فہم ہونا بہت ضروری ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ علمی اصطلاحات کا مانوس اور عام فہم ہونا ضروری نہیں۔ ممکن ہے علوم کی حد تک یہ بات درست ہو لیکن قانون کی وسیع عملداری اور عوام کی روزمرہ زندگی میں اس کے بڑھتے ہوئے عمل دخل کے پیش نظر، اس کی اصطلاحات اور زبان کا عام فہم ہونا زیادہ بہتر نتائج پیدا کرسکتا ہے اس لیے ترک حق مرور، روپوش مدیون، قابل ارجاع ثالثی، ضمانت مستمرہ جیسی قانونی اور تظہیر، مستعار خدمتی، حسبہ، مہتمم گرکات، معتمدیہ، مسجل جیسی دفتری اصطلاحات کا چلن کم از کم آج کل کے زمانے میں مشکوک نظر آتا ہے اسی طرح محکمہ جنگلات کے دفتر سے جاری ہونے والے اس قسم کے اشتہارات، معلومات سے کہیں زیادہ تفنن طبع کا سامان فراہم کرتے ہیں:

بذریعہ نوٹس ہذا ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ درختان عمر رسیدہ و کٹائی شدہ و چوب حاصل کردہ از سٹر کات تحصیل بنوں بروز .... بتاریخ .... بوقت......... نیلام کیے جاویں گے۔

ایک اور ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے زبان و اسلوب سے خواہ کتنے ہی قانونی تقاضے پورے ہوتے ہوں لیکن آج کے انسان کا ذہن اس اسلوب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ اقتباس ایک اقرار نامے سے لیا گیا ہے:

"سیکٹر G-8 میں واقع پلاٹ نمبر ۲ برقبہ 30 × 70 میرا خرید کردہ خود بلاشرکت غیرے ہے اور کوئی امر مانع انتقال نہیں ہے۔ چنانچہ اب مظہر نے سالم پلاٹ مذکورہ بالا بعوض ایک لاکھ بارہ ہزار روپیہ نصف جن کے مبلغ ۵۶ ہزار ضرب دولت پاکستان ہوتے ہیں، بدست و بحق فلاں ولد فلاں ساکن ... اسلام آباد بیع قطعی و دائمی کر دیا ہے مظہر نے سالم زرِ ثمن ازاں مشتری مذکورہ وصول پایا۔ اقرار نامہ ہذا بقائمی ہوش و حواس خمسہ و بر ضاد رغبت خورسنداً لکھ دیا ہے۔"

قانونی اور دفتری زبان کی سادگی کا مطالبہ کتنا ہی جائز اور درست کیوں نہ ہو اس پر عمل کرنا بہر حال آسان نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قانون کی زبان لکھنے والا شخص اپنی تحریر میں صحت، قطعیت اور حتمیت پیدا کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ اس میں کوئی قانونی سقم باقی نہ رہے لیکن اس احتیاطی کوشش میں زبان و اسلوب عموماً مشکل ہوجاتے ہیں۔ یہی حال دفتری زبان کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں دفتری اور قانونی زبان کے انگریزی سانچوں کو اردو میں منتقل کرنا ہوتا ہے اس سے یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ انگریزی قانون و دفتر ایک مختلف ماحول اور پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اتنے مختلف اداروں اور عہدوں کے حوالے ملتے ہیں جن کا متبادل یہاں تلاش کرنا آسان نہیں ہے پھر انگریزی اور اردو اپنے مزاج اور ساخت کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ اس لیے قانونی و دفتری زبان کو سادگی کی شرط کے ساتھ اردو میں منتقل کرنا بہت ہی محنت طلب کام ہے۔

قانونی و دفتری اصطلاحات و دستاویزات کے اردو ترجمے کے مسائل بنیادی طور پر وہی ہیں جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے ہیں۔

یہ تحریریں اگر قانونی و دفتری ہوں اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اصطلاحات سازی یا ان کے ترجمے میں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اردو اس معاملے میں کن زبانوں پر انحصار کرے۔ اس سلسلے میں اردو نے عربی و فارسی کے سرمائے سے استفادہ کیا ہے۔ حیدر آباد دکن کے ابتدائی ترجموں میں عربی کا زور رہا پھر فارسی سے بھی مدد لی گئی۔ ایک زمانے میں عربی و فارسی جاننے والے لوگ بھی بہت تھے۔ اب ان زبانوں سے ہمارا وہ تعلق نہیں رہا۔ آزادی سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ اردو کو ہندوستانی بنانے کے شوق میں اسے عربی فارسی سے دور رکھنے کی کوشش بھی کی گئی۔ پاکستان میں سائنس و ٹیکنالوجی کی خاطر ان زبانوں کو نظر انداز کیا گیا اس لیے اگر قانونی و دفتری اصطلاحات میں عربی کا زیادہ استعمال کیا جائے تو ان کا سمجھنا آسان نہیں ہوگا۔ مقتدرہ کی مجلس استناد نے خالص عربی اصطلاحات کے مقابلے عربی کے ساتھ فارسی سابقے لاحقے لگا کر اصطلاح سازی کو قابل ترجیح قرار دیا ہے اس سے اصطلاحات زیادہ آسان اور عام فہم ہوگئی ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

مرابط : رابطہ کار۔

استناد : معیار بندی۔

محاسب : حسابدار۔

معتمدیہ : دیوان حکومت۔

محضر : یادداشت۔

مدیون : قرضدار۔

دائن : قرضخواہ۔

خازن : خزانچی۔

فارسی کے ساتھ لسانی قربت کی وجہ سے اردو نے اصطلاح سازی میں بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ فارسی برصغیر میں دفتری و قانونی زبان رہی ہے اور اس شعبے میں اصطلاحات کا بڑا ذخیرہ بھی رکھتی ہیں لیکن اس ذخیرے سے زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ محکمہ مال کی اصطلاحات میں البتہ اس کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ ان اصطلاحات سے استفادہ نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ تو شاید یہ ہے کہ ان کو یکجا نہیں کیا گیا، دوسرے موجودہ تشکیلات میں یہ زیادہ کارآمد بھی نہیں رہیں۔ ایران میں فارسی اصطلاحات جدید دور

کا ساتھ تو دے سکتی ہیں لیکن جدید فارسی اردو کے لیے اتنی مانوس نہیں رہی بعض لسانی تبدیلیوں کی وجہ سے بھی یہ فارسی اہل اردو کے لیے قابل فہم نہیں رہی مثلاً ایران میں مدیر کا لفظ ڈائرکٹر کے معنوں میں آتا ہے ہمارے ہاں اس کا مطلب ہی اور ہے، بعض نئے لفظ سادہ اور رواں ہونے کے باوجود اردو میں چل نہیں سکتے مثلاً۔

سازومان : تنظیم۔

ساختمان : بلڈنگ۔

استاندار : گورنر۔

ایران میں اصطلاح سازی بہرحال بڑے سائنسی خطوط پر ہوئی ہے اردو میں اصطلاحات سازی کے معاملے میں ان اصولوں سے مدد لی جا سکتی ہے جو اصطلاحات اردو میں چل سکتی ہوں انھیں قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ حساب دار، کتاب دار، اقبال شناس، اقبال شناسی جیسی ہلکی پھلکی اصطلاحات مقتدرہ نے بھی قبول کرلی ہیں۔ اصطلاح سازی میں فارسی کی پیروی کا ایک نقصان بھی ہوا ہے وہ اس طرح کہ ہماری اصطلاحوں پر فارسیت کا غلبہ ہوگیا ہے اگر کسی اصطلاح میں فارسیت نہ ہو تو اسے قبولیت کی سند نہیں ملتی۔ انگریزی اصطلاحات میں of آ جاتا ہے لیکن اردو میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اصطلاح میں کا، کی نہ آنے پائے اس سے اصطلاح کی خوبصورتی میں فرق آ جانے کا لیکن فارسیت پر اتنا اصرار اردو کی حق تلفی کے مترادف ہے۔ ''ـِ'' سے بچنے کے لیے عام طور پر اضافت استعمال کی جاتی ہے اردو میں اضافت کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے مثلاً اردو میں مندرجہ ذیل تراکیب اضافت کے ساتھ اضافت کے بغیر دونوں طرح درست ہیں:

افسر حسابات :	افسر، حسابات۔
صدر شعبہ اردو :	صدر، شعبہ اردو۔
منتظم اشتہارات:	منتظم، اشتہارات۔
معاون تعمیرات :	معاون، تعمیرات۔
ناظم صحت عامہ :	ناظم، صحت عامہ۔

مقتدرہ میں ''کا'' سے بچنے کے لیے اردو کی علامت سکتہ کا استعمال کیا گیا اور کہیں کہیں بریکٹ سے بھی یہ فائدہ اٹھایا گیا ہے برصغیر

میں انگریزی زبان کی حکمرانی کو سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے اس دوران اس کی حیثیت ایک مؤثر لسانی عامل کے رہی ہے۔ انگریزی کے سیکڑوں الفاظ و تراکیب اردو میں راہ پا چکے ہیں۔ بعض انگریزی الفاظ اردو لفظوں کی جگہ لے چکے ہیں، لیکن اصطلاح سازی کے معاملے میں انگریزی کے بارے میں دو انتہا پسندانہ نقطہ ہائے نظر ملتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انگریزی کی کسی اصطلاح کو قبول ہی نہیں کرنا چاہیے دوسرے یہ کہ انگریزی اصطلاحات کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے دونوں نظریے بعض لسانی حقیقتوں کے انکار پر مبنی ہیں۔ ایک طبقہ انگریزی کو اور دوسرا اردو کو اس کا جائز حق نہیں دینا چاہتا۔ انگریزی کی عام فہم اصطلاحات کو باقی رکھنا چاہیے بشرطیکہ اردو میں ان کا لکھنا اور بولنا آسان ہو مثلاً یہ الفاظ اردو میں عام ہیں ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں:

"فارم، اپیل، کمشنر، جج، ڈاکٹر، کلرک، ماسٹر، سرجن، بیرسٹر، فیس، فل بنچ، بل، سمن، کرس، بانڈ وغیرہ ان سادہ الفاظ کے اردو ترجمے مشکل اور نامانوس ہوں گے۔ بعض انگریزی الفاظ کو اردو میں استعمال کرنے کے بارے میں دہلی کالج کے علما کی رائے تھی کہ اگر ہماری مشرقی زبانوں کی لغات میں کوئی ہم معنی لفظ نہ ملے اور پنڈتوں اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے یہ بہتر ہے کہ انگریزی لفظ ہی اختیار کر لیا جائے۔ یہ سفارش تو اس زمانے کی ہے جب انگریزی ابھی برصغیر میں اپنے قدم جما رہی تھی اب تو اس کو آئے ہوئے بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس عرصے میں لوگ انگریزی الفاظ سے کافی مانوس ہو چکے ہیں اس لیے سادہ اور عام فہم انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو اردو میں باقی رکھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

انگریزی سے اردو میں اصطلاحات کے ترجمے میں بعض اوقات کچھ دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ بعض عہدوں کے ساتھ جنرل کا لفظ بطور لاحقے کے استعمال ہوتا ہے مثلاً سیکرٹری جنرل، آڈیٹر جنرل، اسسٹنٹ کمشنر جنرل وغیرہ، اردو میں جنرل کا ترجمہ عام طور پر عمومی کیا جاتا ہے حالانکہ ہر جگہ یہ ترجمہ ٹھیک نہیں بیٹھتا کسی جگہ تو جنرل

کا مطلب اعلیٰ عہدے کا اظہار ہوتا ہے اور کسی جگہ عہدیدار کے فرائض کی نوعیت کا۔ پہلی صورت میں اس کا ترجمہ اعلیٰ اور دوسری صورت میں عمومی ہونا چاہیے سابق الذکر اصطلاحات کا ترجمہ ہوگا معتمد اعلیٰ، محاسب اعلیٰ، معاون مامور کمشنر عمومی بعض عہدے ایسے ہیں جن میں جنرل کی جگہ چیف آتا ہے اس کا ترجمہ بھی اعلیٰ کیا جا سکتا ہے جیسے چیف انجینئر کا اعلیٰ انجینئر اسی طرح مدیر اعلیٰ، سالار اعلیٰ وغیرہ بعض اوقات ایک ہی عہدے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ چیف بھی آ جاتا ہے اور جنرل بھی، ایسی صورتوں میں ان دونوں لاحقوں کے ترجمے الگ الگ ہونے چاہییں کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

چیف اکاؤنٹنٹ :	حسابدار کبیر۔
اکاؤنٹنٹ جنرل :	حسابدار اعلیٰ۔
چیف سکرٹری :	معتمد کبیر۔
سیکرٹری جنرل :	معتمد اعلیٰ۔

کبھی کبھی سینئر کا لاحقہ بھی آ جاتا ہے جیسے سینئر اکاؤنٹنٹ اعلیٰ و کبیر کے بعد سینئر کا ترجمہ کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا ویسے کبیر بھی کوئی اچھا ترجمہ نہیں، لے دے کر متقدم اور مقدم کے لفظ رہ جاتے ہیں، کیونکہ یہاں بزرگ و کلاں بھی کام نہیں دے سکتے۔ جناب مختار مسعود نے ہماری مجلس استناد میں یہ تجویز کیا تھا کہ عہدوں میں ترتیب مراتب کو اول، دوم وغیرہ ظاہر کیا جائے مثلاً:

سیکرٹری جنرل :	معتمد اعلیٰ
سیکرٹری :	اول معتمد یا معتمد اول
ایڈیشنل سیکرٹری :	دوم " " " دوم
ڈپٹی سیکرٹری :	سوم " " " سوم
انڈرا اسسٹنٹ سیکرٹری :	چہارم " " " چہارم

بعض عہدوں میں کام کی نوعیت تقریباً ایک ہی ہوتی ہے لیکن انگریزی میں ان کے لیے نام مختلف آتے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل عہدیدار ایک ہی قسم کے انتظامی سربراہ ہیں ان کے انگریزی نام اور ترجمے

ملاحظہ فرمائیں :

انسپکٹر جنرل پولیس	ناظر اعلیٰ پولیس
ڈائریکٹر آف ایجوکیشن	ناظم تعلیم
ایڈمنسٹریٹر اوقاف	منصرم اوقاف
مینیجر	
کنٹرولر ایگ زامی نیشن	ناظم امتحانات

کیا ان اصطلاحات کے ترجمے میں انگریزی کی پیروی ضروری ہے کیا ان پانچ لفظوں کی بجائے ایک دو لفظوں سے گذارہ نہیں ہو سکتا مثلاً ان اصطلاحات کو اردو میں اس طرح بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔

ناظم اعلیٰ پولیس۔

ناظم تعلیم۔

ناظم اوقاف۔

ناظم بینک۔

ناظم امتحانات۔

اردو میں ایڈمنسٹریٹر اور منیجر کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے منصرم اور منتظم کے استعمال پر کیوں اصرار کیا جائے اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر جگہ ناظم ہی کا لفظ اختیار کیا جائے اس فہرست کو جہاں تک ممکن ہو کم کیا جائے اس سے عام فہم اصطلاحات وضع کرنے میں آسانی رہے گی۔

انگریزی کی بعض اصطلاحات کے لیے اردو میں موزوں ترجمہ نہیں ملتا یا جو ترجمہ کسی زمانے میں ہوا تھا وہ اب موزوں نہیں رہا۔ ایک زمانے میں الاؤنس کو اردو میں بھتہ کہا جاتا تھا، لیکن جتنی قسم کے الاؤنس آج کل دیئے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ لفظ موزوں نہیں، خاص طور پر اس سے تراکیب بنانا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح ایڈیشنل کے لیے زاید اور اضافی میں سے کوئی لفظ بھی استعمال نہیں ہو سکتا، کیونکہ دونوں کی دلالت اب منفی ہو گئی ہے انچارج کا ترجمہ تحویلدار کیا جاتا ہے اس کی جگہ ذمہ دار استعمال ہو سکتا تھا لیکن یہ قیمتی لفظ

پہلے سے غارت شدہ الفاظ کی فہرست میں شامل ہے اس قسم کی اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

انگریزی اصطلاحات کے ترجمے میں ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ بعض اوقات انگریزی کی مختلف اصطلاحات کے لیے اردو میں ایک ہی لفظ استعمال کیا جا رہا ہے کہیں ایک ہی لفظ سے بھی گذارہ کیا جا سکتا ہے جیساکہ میں نے عہدیداروں کے سلسلے میں اس کی مثالیں دی ہیں لیکن ہر جگہ ایسا کرنا ممکن ہے نہ مناسب مثلاً۔

Accord ،pact, protocol, agreement کے لیے عام طور پر معاہدے کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے حالانکہ یہ سب اصطلاحات انگریزی میں معنوی فرق کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں، ایسی صورتوں میں ایک حل یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ اس فرق کو ظاہر کرنے کے لیے عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ مختلف مفاہیم میں استعمال کیے جائیں کسی جگہ سمجھوتا کہیں پیمان، کسی جگہ معاہدہ اور کہیں میثاق لائے جائیں یہ لفظ تو مختلف ہو گئے لیکن معنوں کا مسئلہ حل نہ ہوا اس کے لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ لفظ معاہدہ کے ساتھ توجیحی الفاظ لگائے جائیں۔ جیسے ابتدائی معاہدہ قطعی معاہدہ وغیرہ اسی طرح Law, Statute, act کو بھی اردو میں قانون ہی کہا جاتا ہے انہیں بھی توجیحی لفظوں کے ساتھ اردو میں منتقل کرنا چاہیے مثلاً (Law) قانون، (Statute) قانون موضوعہ، (act) لائحہ وغیرہ Aims objective اور purpose کا ترجمہ بھی اسی طرح کیا جانا چاہیے۔

دفتری و قانونی دستاویزات کے ترجمے میں اردو جملے کی ساخت بھی خاصی دشواری پیدا کرتی ہے۔ انگریزی کے مقابلے اردو جملہ بالکل اکھرے بدن کا ہے ذیلی جملوں کا اس پر بوجھ پڑے تو اس کا سانس پھول جاتا ہے۔ دفتری و قانونی جملے اکثر پیچیدہ ہوتے ہیں مرکب ہوتے ہیں ان کو اردو میں اسی طرح منتقل کرنا آسان نہیں ہے۔ قانونی جملوں میں ذیلی جملے Sub Clauses وضاحتی کردار انجام دیتے ہیں۔ اگر اردو ضمائر موصولہ جو جنہوں وغیرہ استعمال کیے جائیں تو اس سے جملے میں روانی باقی نہیں رہتی اور اس کی بندش کمزور ہو جاتی ہے۔ اگر بڑے

جملے کو چھوٹے جملوں میں تقسیم کیا جائے تو اجزائے جملہ کا باہمی تعلق کمزور ہو جاتا ہے ۔

انگریزی جملے کو رموز اوقاف سے بھی بڑی مدد ملتی ہے جملہ خواہ کتنا طویل ہو رموز اوقاف کے استعمال سے اس کے اجزا اور ان کا باہمی تعلق واضح رہتا ہے ۔ قانون کی زبان بڑی محتاط ہوتی ہے اس میں تو ایک علامت کے ادھر ادھر ہونے سے مفہوم میں فرق آ جاتا ہے اور اس سے کاروبار مملکت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔ اردو میں جملہ قواعد و قوانین شرائط و ضوابط اور دستاویزات انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جا رہی ہیں اور چونکہ ان کے انگریزی متن میں رموز اوقاف آتے ہیں ۔ ان کو اردو ترجمے میں استعمال کیے بغیر ترجمے کی صحت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ۔

قانونی اور دفتری دستاویزات کے ترجمے کے پرانے اسلوب کو بھی اب ترک کرنے کی ضرورت ہے ۔ یا اسے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے ۔ ''ہرگاہ ''اردو میں کہیں اور استعمال نہیں ہوتا ۔ یہ صرف قانونی دستاویزات کے ترجمے ہی میں آتا ہے ۔ Whereas کا کوئی اور ترجمہ کیا جا سکتا ہے ایران والے نظرباینکہ کہتے ہیں اردو میں اس بات کے پیش نظر لکھا جا سکتا ہے ۔ اسی قسم کی کچھ اور مثالیں ۔

اب مندرجہ بذریعہ ہذا قرار پایا ۔

قومی زبان کے استعمال کو بہ تعجیل عمل میں لانے کے لیے ۔

ان کا معاوضہ خدمات اور ملازمت کے دیگر شرائط و ضوابط ان قواعد کے تحت ۔

منضبط ہوں گے جنہیں میں مقتدرہ وفاق حکومت سے پیشگی منظوری حاصل کرکے تشکیل دے گی ۔

ہمراہ منظوری مرسل ہو وے ۔

ان کی بجائے سادہ اسلوب اپنانے کی ضرورت ہے ۔

مآخذ

۱ ۔ سمر قندی ، نظامی عروضی (فارسی) چہار مقالہ تہران ۱۳۱۰ ھ ش ۔

۲ ۔ گاورزہ سراونسٹ (انگریزی) پلین ورڈز پیلی کن بکس مڈل سیکس انگلینڈ ۱۹۶۷ء ۔

۳ ۔ تنزیل الرحمان ، ڈاکٹر قانونی لغت لاہور ۱۹۷۶ء ۔

۴ ۔ مولوی ، ڈاکٹر عبدالحق اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ کراچی ۱۹۳۱ء ۔

۵ ۔ شبلی ، ڈاکٹر محمد صدیق خان دفتری اردو اسلام آباد ۱۹۸۳ء ۔

۶ ۔ شبلی ، ڈاکٹر محمد صدیق خان دفتری مراسلت اسلام آباد ۱۹۸۳ء ۔

وفاق و صوبائی عہدوں کے نام اسلام آباد ۱۹۸۵ء ۔

۸ ۔ قریشی ، ڈاکٹر وحید مدیر مسئول ماہنامہ اخبار اردو ج : ۲ ، شمارہ ۹ ، ۱۹۸۵ء ۔

ڈاکٹر انور محمود خالد

مقالات: پروفیسر نیاز عرفان
ڈاکٹر صدیق شبلی
تبصرہ: ڈاکٹر معین الرحمٰن

منصور قیصر:

اصطلاحات وضع کرتے ہوئے اردو کی تنگ دامانی کا احساس اس لیے ہوتا ہے کہ ہم غیر ملکی زبانوں پر زیادہ تکیہ کرتے ہیں۔ جب کہ ہماری دوسری پاکستانی زبانیں اپنے دامن میں نہایت وسیع ذخیرہ الفاظ رکھتی ہیں۔ ہمیں اصطلاحات وضع کرتے ہوئے ان زبانوں سے اخذ و اکتساب کرنا چاہیے۔

شان الحق حقی:

مظفر علی سید صاحب نے بھی اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا تھا، کہ اصطلاحات وضع کرتے ہوئے تمام پاکستانی زبانوں سے کسب فیض کیے بغیر ہم اپنے کام کو آسان نہیں بنا سکتے۔ جہاں تک دفاتر میں نفاذ اردو کے ضمن میں جو رکاوٹیں نظر آرہی ہیں اور انگریزی کے مقابلے میں اردو کے مترادفات لانے کے راستے میں جو دشواریاں حائل ہیں، اس کے لیے ہم صوبائی زبانوں کے ذخیرہ سے الفاظ لے سکتے ہیں۔

اردو کی اصطلاحات وضع کرتے ہوئے اس وقت دو مکتبہ فکر سامنے ہیں، ایک یہ کہ انگریزی اصطلاحات اور ناموں کو یوں ہی رہنے دیا جائے لیکن دوسرا نقطہ نظر دوسری انتہا پر ہے اور وہ مکمل ترجمے کی حمایت کرتا ہے۔ ہمارے لیے یہ بات مناسب ہوگی، کہ ہم انتہا پسندی

سے گریز کریں اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی اس بات سے اتفاق کریں، کہ غیر مانوس اور اجنبی ترجموں سے گریز کریں اور جو نام ہماری زندگی میں زیادہ رچ بس گئے ہیں، انھیں تبدیل نہ کریں۔ جیسے بورڈ وغیرہ ہمارے نظام اصوات پر پورے اترتے ہیں، قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

احسان اکبر:

ہم قومی زبان کے نفاذ کے لیے جن مراحل سے گزر رہے ہیں، وہ نہایت بردباری اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ہمیں یقیناً ایسے ناموں یا الفاظ کو تبدیل کرنے سے گریز کرنا چاہیے، جو ہماری زبان میں آسانی سے کھپ گئے ہیں اور اجنبی محسوس نہیں ہوتے، لیکن انگریزی دوستی کے جذبے میں کہیں ایسا نہ ہو، کہ نفاذ اردو کا عمل ہی رک جائے؟ میں سمجھتا ہوں، کہ انگریزی کے مترادفات کی تلاش کرتے ہوئے، اب تک ہمارا رویہ محققانہ تجسس کا حامل نہیں ہوا۔ ہم نے اردو مترادفات کی تلاش میں بھی انگریزی میں سوچنے کی عادت ترک نہیں کی۔ جب تک ہم انگریزی میں سوچ کر اردو مترادف تلاش کریں گے ہم دفتری نظام میں تبدیلی نہیں لاسکتے۔

رشید امجد:

اصل مسئلہ یہ ہے، کہ ہم نفاذ اردو کے ضمن میں کس طرح آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے، کہ ہم اب تک کے انگریزی کام کو پورا کا پورا اردو میں ترجمہ کر دیں، سرکاری، اہم سرکاری مراسلات احکامات وغیرہ سب کچھ جوں کا توں اردو میں لے آئیں، ایسی صورت میں اصطلاحات مسئلہ بنیں گی، انگریزی میں سوچ کر اردو مترادف تو آسانی سے تلاش نہیں ہوگا، دوسری صورت یہ ہے، کہ ہم دفتری نظام کا ایک بالتفصیل جائزہ لیں، اور ضرورتوں تقاضوں کی روشنی میں نفاذ اردو کی ترجیحات قائم کرکے آگے بڑھیں۔ انگریزی نظام میں درخواست کی منظوری کے لیے کئی لفظ استعمال ہوتے ہیں مثلاً Sanctioned, Approved Ok, Yes 'Granted وغیرہ لیکن اردو میں زیادہ فصیح ایک ہی لفظ تمام انگریزی الفاظ کا احاطہ کر لیتا ہے وہ ہے منظور۔ چنانچہ اگر ہم اپنے

نظام اردو کو دفاتر میں نافذ کرنا چاہتے ہیں ، تو ہمیں اپنی ضرورتوں کا انگریزی کے حوالے سے نہیں ، بلکہ اپنے حوالے سے جائزہ لینا ہوگا -

سرور کامران :

مقالات اور تبصرہ سننے کے بعد مجھے یہ رویہ انتہا پسندانہ لگا ہے کہ ہر لفظ کا ہر صورت میں ترجمہ ہونا چاہیے خواہ وہ مانوس ہو یا اجنبی اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو ، مثلاً اگر ہمارے لیے سٹیٹ بنک آف پاکستان معروف ہے ، تو بنک دولت پاکستان کہنے کی کیا ضرورت ہے -

اشفاق احمد :

جناب سٹیٹ بنک یقیناً معروف ہے ، لیکن بنک دولت پاکستان بھی اتنا ہی معروف اور مروج ہے ، اس لیے کہ ہر نوٹ پر بنک دولت پاکستان ہمیشہ سے تحریر رہا ہے -

سرور کامران :

صدر صاحب میں یہ کہنا چاہتا ہوں ، کہ اگر کوئی نام یا لفظ یا عہدہ اتنا معروف ہو چکا ہے ، کہ وہ اردو میں کھپ گیا ہے ، تو اسے تبدیل نہ کرنا چاہیے - بلکہ اسے اردو کے ذخیرے میں شامل کر لینا چاہیے - جیسے کرنسی نوٹ وغیرہ - اس سے یہ ہوگا ، کہ زبان میں رفتہ رفتہ کشادگی پیدا ہو جائے گی اور اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے برابر لایا جا سکے گا -

شان الحق حقی :

ابھی کچھ دیر پہلے احسان اکبر صاحب نے جو بات کہی تھی ، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے ، کہ عربی میں مادے محدود ہیں ، لہٰذا معرب کرکے الفاظ کو اپناتے ہیں ، یہی حال فارسی کا ہے ، لیکن ہمارے ہاں ایسی صورت نہیں ہے - جہاں تک دفاتر میں نفاذ اردو کے سلسلہ میں دشواریوں کا تعلق ہے ، اسے اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے ، اپنی ضرورتوں کے مطابق نفاذ اردو کا جائزہ لیں ، رشید امجد صاحب نے اس کے لیے صحیح بات کی ہے -

مسعود احمد چیمہ :

نفاذ اردو کے ضمن میں جہاں اور بہت سی دشواریاں حائل ہیں ، وہیں ایک سے زیادہ تراجم نے بھی مشکلات پیدا کر رکھی ہیں - ایک ادارہ کسی لفظ کا ترجمہ کچھ کرتا ہے ، تو دوسرا کچھ — مثلاً ہم نے اکاؤنٹنٹ جنرل کا ترجمہ ناظم اعلیٰ حسابات کیا ہے اور یہی مروج ہے جب کہ اب اس کا ترجمہ حسابدار اعلیٰ کر دیا گیا ہے ، یہ علمی مشکلات ہیں ، جسے آپ کیسے نظر انداز کریں گے -

نیاز عرفان :

اصل بات یہ ہے ، کہ پہلے وفاقی سطح پر ایسا کوئی ادارہ مؤثر نہیں تھا ، کہ ناموں ، عہدوں اور محکموں کے ناموں کی معیار بندی کر سکے اور اسے تمام ادارے اختیار کر لیں - مگر اب مقتدرہ قومی زبان یہ کردار بطریق احسن ادا کر رہا ہے - اس کے ماہرین کی مجالس استناد یہ کام کر رہی ہیں اور ان مجالس میں ہر شعبہ سے متعلق ماہرین موجود ہیں ، جو تمام تر عوامل کے جائزے کے بعد مترادف لاتے ہیں - چنانچہ اسے حتمی سمجھنا چاہیے -

جلیل عالی :

اکاؤنٹنٹ جنرل کے لیے ناظم اعلیٰ حسابات یوں بھی درست نہیں ہے اس لیے کہ ڈائریکٹر کے لیے ناظم اور ڈائریکٹر جنرل کے لیے ناظم اعلیٰ دیر سے مروج ہے اور حسابدار اعلیٰ مناسب لگتا ہے اور پھر نطق کے اعتبار سے جتنی دشواری اکاؤنٹنٹ جنرل کہنے میں ہوتی ہے وہ حسابدار اعلیٰ کہنے میں نہیں ہوتی - اب رہی بات معروف ہونے کی ، تو میرا خیال ہے ، اگر یہ استعمال میں آ گیا ، تو یقیناً قبولیت عام حاصل کر لے گا -

اشفاق احمد :

اصل بات یہ ہے ، کہ اب اصطلاحات کو روکا نہیں جا سکتا - اگر غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحات مناسب طور پر اور پورے تفکر کے ساتھ ترجمہ نہیں ہوں گی تو معروف نہ ہو سکیں گی مثلاً لفظ ڈائریکٹر کا صرف اردو میں ترجمہ کا سوال نہیں ہے - پورے اس معاشرتی تکریم اور

Status کا سوال ہے جو لفظ ڈائریکٹر سے وابستہ ہے۔ لفظ ڈائریکٹر کے ترجمہ پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا، مگر عام لوگ جو تکریم اور مرتبہ لفظ ڈائریکٹر سے وابستہ کیے ہوئے ہیں ترجمہ کے ساتھ کیا وہ لوگ بھی بدلنے پر آمادہ ہوں گے۔ ہر لفظ ایک مخصوص معاشرے میں اپنے لیے جگہ بنالیتا ہے۔ جیسے لفظ ڈائریکٹر کو لے لیجیے اس کے لہجے یا تکریم اور رتبہ کا جو پس منظر بنا لیا گیا ہے، وہ ناظم میں نظر نہیں آئے گا اور لوگ ڈائریکٹر کہلا کر جس قدر بڑا محسوس کرتے ہیں وہ ناظم کہلا کر محسوس نہیں کرتے ہم انگریزی کی جگہ اردو کو لا رہے ہیں مگر انگریزی زبان نے جو اچھے برے اثرات ہمارے معاشرے پر مرتسم کیے ہیں، انھیں ہم نہیں بدلنا چاہتے۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جب ہم کوئی لفظ ترجمہ کرتے ہیں، تو اصل میں پورے معاشرتی ڈھانچے کی تبدیلی کی طرف بڑھتے ہیں لہٰذا لفظ کے وقت وہ تمام عوامل جو انگریزی لفظ سے وابستہ ہیں، جب تک سامنے نہیں رکھیں گے پیش رفت نہیں ہو سکے گی۔

اب آئیے دفتری زبان اردو کی طرف۔ یہ کام بظاہر جتنا آسان ہے اصلاً اتنا آسان نہیں ہے۔ ہمارا رویہ اصل چیز ہے۔ مثلاً دیکھیے ہم مال روڈ کا نام اب تک تبدیل نہیں کر پائے، اس لیے کہ ہم ترجمہ کرتے وقت یا مترادف لاتے ہوئے تمام عوامل کو سامنے نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس جو نام تفکر کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ فوراً قبول عام کی سند حاصل کر لیتے ہیں، مثلاً باغ جناح، اسی طرح مری روڈ کا نام شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی رکھا گیا ہے، جو کبھی معروف نہیں ہو سکا، ہو ہی نہیں سکتا۔

اردو میں مترادفات لانے کے لیے لوگوں کو اس طرف مائل کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمیں اپنے حلقہ اثر میں اردو اصطلاحات کو رواج دینا چاہیے دفاتر کے لیے اردو لانے میں اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اس لیے کہ دشواریاں زیادہ یہیں ہیں۔ ہمیں اپنی قریب کی زبانوں سے کسب فیض میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ آخر ہم باہر کی دوسری زبانوں سے بھی تو اخذ و اکتساب کرتے ہیں۔

اب آخری بات — جو سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ کہ حکومت اور حکومتی ادارے سنجیدگی کے ساتھ نفاذ اردو چاہتے ہیں، مگر عوام

الناس نہیں چاہتے، اس کا ثبوت حکومت کے اکثر بورڈ اردو میں لکھے نظر آئیں گے یا انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی نظر آئیں گے لیکن دوکانوں کاروباری اداروں، کارخانوں حتیٰ کہ گھروں کے دروازوں پر بھی انگریزی بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں۔ کیا ہم اس طرف توجہ نہیں دے سکتے؟

خواتین و حضرات! اردو معاشرے میں نافذ کرنے کے لیے سب سے پہلے ذہنوں میں اردو لانا ضروری ہے اور اس کام کے لیے بڑے سبھاؤ کی ضرورت ہے۔ بہر طور ہم آگے بڑھ تو رہے ہیں، لیکن اس کی رفتار بھی بڑھانے کی ضرورت ہے۔

چوتھی نشست
ادب اور صحافت میں تراجم کے مسائل

صدارت	لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن ، معتمد وزارت ثقافت ، سیاحت و کھیل
مہمان خصوصی	اشفاق احمد
افسانوی ادب کے تراجم مسائل اور مشکلات	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی (مقالہ) انتظار حسین (تبصرہ)
شعری ادب کے تراجم مسائل اور مشکلات	شان الحق حقی (مقالہ) پروفیسر جیلانی کامران (تبصرہ)
صحافت میں ترجمے کے مسائل اور مشکلات	ڈاکٹر مسکین حجازی (مقالہ)
گفتگو (بحث چوتھی نشست)	ڈاکٹر ریاض مجید/اعجاز راہی

rekhta
rekhta

افسانوی ادب کے تراجم — مسائل اور مشکلات

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

ترجموں کے سلسلے میں خواہ ترجمہ تخلیقی ادب کا ہو یا علوم کا، سب سے اہم مسئلہ وہ ذہنی رویہ ہے جو ترجموں کو ذہنی اختراع کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ یہ صورت حال انیسویں صدی کی رومانوی تحریک سے پیدا ہوئی جس نے ذہنی اپج یا اختراع کو برتر مقام پر فائز کیا اور اس کے مقابلے میں ترجمہ دوسرے درجے کا ذہنی عمل ٹھہرا۔ بیشک وقت کے گزرنے کے ساتھ ہم نے بہت سے ذہنی رویے ترک کر دیے —— معاشرتی سطح پر بھی اور تخلیقی طریق کار کے حوالے سے بھی۔ لیکن یہ تصور کہ ترجموں کی بھی ایک تخلیقی اہمیت ہے فی الحال رواج نہیں پاسکا ہے۔ عام تصوراب بھی یہی ہے کہ ترجمے میں اختراع ذہن کا کوئی عمل نہیں ہوتا، اس لیے اس کی حیثیت تخلیقی فن پاروں کے برابر نہیں ہے۔ حالانکہ یورپی نشاۃ ثانیہ سے پہلے انگریزی زبان کے اولین شاعروں میں سے ایک شاعر چاسر (Chaucer) نے فرانسیسی نظم ''روماں دی لا روز'' کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا تو فرانسیسی شاعر نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے Maker کا لقب دیا جس کے معنی تھے شاعر۔

کلاسیکی روایت میں تقلیدی زاویہ' نظر کی اہمیت کے تحت ترجموں کی حیثیت بھی تخلیقی فن پاروں کے برابر تھی۔ تاریخی لحاظ سے دیکھیے تو احیاءالعلوم کی تحریکوں کے پیچھے یا کسی قوم کے فکری اور شعوری ارتقا میں ہمیں ترجموں کا کردار بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ خلافت عباسیہ کے دور میں یونانی علوم کے تراجم، یورپی احیاء العلوم کی تحریک کے پس منظر میں اسلامی علوم کے تراجم، ہر دو صورت حال اس بات کا ثبوت ہیں کہ فکر و شعور کی بلندی اور تہذیبی تحریک میں ترجمے خاص کردار ادا کرتے

ہیں۔ خود ہماری زبان میں سرسید کے دور کی فکری فضا میں، بعد ازاں رومانوی دور میں اور پھر ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ترجمے ہوئے اور بہت ہوئے۔ محض ترجموں کے حوالے سے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پورا عہد تہذیبی تحرک کا عہد رہا ہے۔

اقوام کے درمیان لین دین اور افہام و تفہیم محض معاشی و سیاسی سطح پر نہیں ہوتی، فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے۔ اس سطح پر دیکھا جائے تو ترجموں کی اہمیت و وقعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تاہم آج کے حالات میں علوم جدیدہ کے حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ اہم بات اپنی کم مائیگی اور تہی دستی کے ازالے کی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر تعلیم تو اردو میں ہوتی ہے مگر بیشتر سائنسی و غیر سائنسی علوم کی تدریس کے لیے اردو زبان میں کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ انسانی فکر و شعور کی ضمانت تو محض زبان ہے اور اگر زبان کم مایہ و تہی دست ہو تو ذہنی سطح بھی اسی لحاظ سے پست ہو جائے گی۔ اس صورت حال میں ترجموں کی اہمیت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تدریسی سطح پر چند حضرات نے انگریزی زبان سے اخذ و ترجمے کی کوشش کی ہے اور اردو میں کتابیں مدون کی ہیں۔ ان کوششوں کو یقیناً سراہنا چاہیے۔ تاہم ترجمے اپنے طور پر چند باتوں کے متقاضی ہیں جن کی غیر موجودگی میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس سے پیشتر کہ میں افسانوی ادب کے ترجموں کے مسائل و مشکلات کا ذکر کروں ایک جملے کی مثال سے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جملہ میں نے شہریت کے مضمون سے متعلق ایک اردو کتاب میں پایا ہے۔ قانون کے باب میں پہلا جملہ یوں ہے: ''قانون کی اصطلاح قدیم جرمن لفظ 'Lag' سے ماخوذ ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کتاب میں لفظ ''قانون'' کی جگہ انگریزی لفظ ''Law'' ہوگا اور اس انگریزی لفظ کا قدیم جرمن لفظ سے ماخوذ ہونا قرین قیاس ہے مگر انگریزی لفظ کی جگہ عربی لفظ قانون رکھ کر جملہ کو اس طرح ترجمہ کر لینا محل نظر ہے۔

اس مثال سے محض یہ بات واضح کرنی مقصود تھی کہ اگر ترجمہ کرنے کی بنیادی ضرورت، یعنی ہر دو زبانوں پر قدرت پوری ہوتی ہو تو بھی ترجمہ محض میکانکی عمل نہیں ہے۔ علوم کا ترجمہ کرتے وقت بھی

تخیل کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مترجم کو اتنی ذمہ داری تو قبول کرنی چاہیے کہ اپنے قارئین تک صحیح مفہوم پہنچائے ۔

علوم کے ترجمے تک تو بات تھوڑی بہت احتیاط برتنے کے علاوہ نسبتاً آسان ہے ۔ وہاں سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحوں کے ترجمے کا ہوتا ہے ۔ اصطلاح سازی کا کام ہمارے بہت سے اداروں نے کیا ہے اور اگر وضع شدہ اصطلاحیں دستیاب نہ ہوں اور کوئی واضح اصطلاح نہ بن سکتی ہو تو ایسے الفاظ کو جوں کا توں قبول کر لینا چاہیے ۔ اصطلاحیں تو بعد میں بھی بنتی رہیں گی ۔ فی الحال زیادہ ضرورت علوم کو منتقل کرنے کی ہے ۔ علوم کے ترجمے کے لیے دو زبانوں پر قدرت اور علم کو سمجھنا ، یہی کافی ہے ۔ وہاں مسئلہ صرف مواد کا ہوتا ہے ، اسلوب کا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم ۔ زیادہ عقل چاہیے اور تخیل محض اتنا کہ آپ لفظ ''قانون'' کو قدیم جرمن زبان کے کسی لفظ سے ماخوذ نہ بتائیں ۔

افسانوی ادب کے ترجمے کی بات اور ہے ۔ ایسی صورت میں دو تہذیبیں ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتی ہیں ۔ ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے ۔ ویسے تو ہر زبان کا ہر لفظ اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے ۔ لفظوں کو آپس میں جوڑنے سے جملے کی ساخت بنتی ہے ۔ ہر جملے کا ایک آہنگ ہوتا ہے ۔ پھر جملے آپس میں مل کر اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ پھر یہ بھی ہے کہ پورے افسانے یا ناول میں ایک فضا کی تعمیر ہوتی ہے ۔ لہٰذا افسانوی ادب کے ترجموں میں ترجمہ محض لفظ کا نہیں ہوتا ۔ جملوں کی ساخت اور آہنگ نیز اسلوب کی نیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور اسے بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے ۔ آخری اہم بات یہ ہے کہ افسانے یا ناول کی تہذیبی فضا کے پیش نظر ایسی پڑتا لفظیات سے کام لینا پڑتا ہے جو ترجموں میں پوری فضا کو منتقل کر سکے ۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہم نے فکر و احساس کی سطح پر مغرب سے متاثر ہونا شروع کیا ۔ مغرب سے صحافتی اسالیب لیے ۔ ایسے (Essay) نظم معریٰ ، سانیٹ ، نظم آزاد ، ناول ، افسانہ ، ڈرامہ ، ان تمام اصناف میں ہم مغرب سے متاثر ہوئے ۔ ہمارا سارا افسانوی ادب ،

داستانوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ، مغرب کی دین ہے اور اس سلسلے میں ہمارے یہاں ترجموں کی روایت بہت مضبوط ہے ۔ سجاد حیدر یلدرم ، خواجہ منظور حسین ، سعادت حسن منٹو ، محمد حسن عسکری ، شاہد احمد دہلوی قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نام اس سلسلے میں نمایاں ہیں ۔

یہ بات غور طلب ہے کہ منٹو ، عسکری قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین جیسے معروف فنکاروں کو ترجمے کرنے کی کیا احتیاج تھی بہ الفاظ دیگر افسانوی ادب کا ترجمہ افسانہ نگار کی کس ضرورت کو پورا کرتا ہے ؟ ۔ مطلب یہ ہے ترجمہ کی بہت سی ضرورتیں تو غیر ذاتی ہوتی ہیں لیکن افسانہ نگار کسی خاص کتاب کو ترجمے کے لیے کیوں منتخب کرتا ہے؟ ایک سامنے کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ ادب کے ترجموں سے فنکار کی اپنی زبان میں وہ ادبی و ذوقی فضا پیدا ہوتی ہے جیسے خود فنکار قائم کرنا چاہتا ہے اور جس میں خود اس کی تخلیقی صلاحیتیں نمو پاتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ بڑی تخلیقی کاوشیں بڑے تناظر میں ہی پیدا ہو سکتی ہیں ۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تخلیقی فنکار دوسری زبان کے لفظوں کے جادو کو اپنی زبان کی لفظیات میں جگانا چاہتا ہے ۔ فقروں کی ساخت اور اسلوب کے جوہر کو منتقل کرتے وقت وہ خود اپنی زبان کو نئے آہنگ ، نئی معنوی وسعتوں ، اظہار کی نئی صورتوں اور نئی افسانوی فضاؤں سے آشنا کرتا ہے اور اسی کے ساتھ اپنی ذات کے تخلیقی حدود کو بھی وسعت دیتا ہے ۔

عام سطح پر دیکھا جائے تو افسانوی ادب کے ترجموں کی مشکلات و مسائل کم و بیش وہی ہیں جو کسی بھی غیر زبان کی تحریر کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت پیدا ہوتی ہیں ۔ تاہم افسانوی ادب کے ترجمے مترجم میں خاص صلاحیت کا تقاضہ کرتے ہیں ۔ اور وہ یہ کہ زبان دانی کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیقی فن کاروں کا سا تخیل بھی ہو ۔ بہ الفاظ دیگر اس میں ایسی منفی صلاحیت (Nagative Capabilty) ہو جس کے باعث وہ ترجمہ کرتے وقت اس زبان میں رچ بس جائے جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہو اور پھر جب اپنی زبان میں ترجمہ کرنے لگے تو اپنی جون میں واپس آ جائے ۔

مرزا یگانہ چنگیزی نے اپنی کتاب آیات وجدانی میں فراق گورکھپوری کے نام ایک خط میں یہ لکھا ہے کہ آپ سوچتے انگریزی میں

اور لکھتے اردو میں ہیں - یہی خبط مرزا غالب کو بھی تھا ، سوچتے فارسی میں اور لکھتے اردو میں تھے- مرزا یگانہ زبان کے سلسلے میں لکھنوی دبستان کی طہارت پسندی کے قائل تھے - انھوں نے اس حیاتیاتی اصول پر غور نہیں کیا کہ طاقت اور حسن دونوں نسلی امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں اور یہی اصول زبانوں پر بھی منطبق ہوتا ہے - فراق اور غالب کیا ہر بڑے شاعر کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ اس حیاتیاتی اصول کو اپنی شاعری میں کس حد تک برتتا ہے - لہذا فراق اور غالب کی جو خاصیت مرزا یگانہ نے بتائی ہے ، ہماری ادنیٰ رائے میں یہی خاصیت مترجم کی بھی ہونی چاہیے - یعنی یہ کہ وہ دونوں زبانوں میں سوچ سکے - محض اسی طرح وہ اس زبان میں رچ بس سکتا ہے جس سے ترجمہ کرنا مقصود ہو - ہم نے ابھی منفی صلاحیت کی بات کی تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی چیز میں شامل بھی ہیں اور اس سے باہر بھی - یہی تخلیقی صلاحیت مترجم کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ افسانوی ادب کا ترجمہ کرتے وقت اپنے تخیل کی مدد سے خود کو دونوں زبانوں میں اس طرح جذب کر سکے کہ اپنی زبان میں دوسری زبان کی روح اور جسم دونوں کو منتقل کر سکے ظاہر کہ یہاں روح سے مراد معنوی جہتیں اور جسم سے مراد اظہار کی مختلف صورتیں ہیں -

زبان کی معنوی اور اظہاری جہتوں میں اضافہ ہو گا تو اس میں تنوع کے ساتھ اجنبیت بھی آئے گی اور اس طرح زبان کا چٹخارہ لینے والوں کو اس میں کچھ نہ کچھ کھردرا پن بھی محسوس ہو گا - اسی لیے بعض لوگ تخلیقی ترجمے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ترجمہ شدہ تحریر ترجمہ نہ معلوم ہو - بہ الفاظ دیگر اس میں کوئی اجنبیت یا کھردرا پن نہ ہو - اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمہ کرتے وقت اپنی زبان کے محاوروں اور روزمرہ کا خیال رکھنا لازمی ہے - مگر دوسری زبان سے ترجمہ کرتے وقت اکثر اس زبان کے محاورے اور روزمرہ کے ترجمے بھی کرنے پڑتے ہیں اور یہ کام تو ہم غیر محسوس طور پر ترجمہ کی ضرورت کے بعد بھی کرتے رہتے ہیں - انگریزی سے نہ جانے کتنے محاورے ہماری زبان میں داخل ہو چکے ہیں - علاوہ ازیں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں افسانوی ادب کے ترجمے میں فقروں کے آہنگ اور اسلوب کا ترجمہ بھی ہونا چاہیے

اور افسانے یا ناول کی پوری فضا بھی ترجمے میں منتقل ہونی چاہیے کہ محض اسی طور ترجمہ تخلیقی سطح کا حامل ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں کچھ نہ کچھ اجنبیت اور کھردرے ان کا ہونا لازمی امر ہے - اسی معنی میں عسکری صاحب اس خیال کے حامل تھے ترجمے کو ترجمہ معلوم بھی ہونا چاہیے -

تخلیقی ترجمے کی مثالیں دیکھنی ہوں تو محمد حسن عسکری ، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے تراجم دیکھیے - عسکری صاحب نے فلابیر ، استندال اور میل ول کو ، قرۃ العین حیدر نے ہنری جیمس کو اور انتظار حسین نے ترگنیف کو اردو میں اس طرح سمویا ہے کہ اردو افسانوی ادب کی فضا ان مختلف رنگوں سے نکھر گئی ہے - مختلف تہذیبوں کا روحانی تحرک ، کرب و انبساط کی ساعتیں ، فقروں کے مختلف آہنگ اور اسالیب کا تنوع ، یہ سب اردو کے پیکر میں ڈھل کر اردو افسانوی ادب کے حدود میں مزید وسعتوں کا سبب بنے ہیں - اسی ذیل میں حالیہ مثال نوجوان افسانہ نگار آصف فرخی کے ترجمے کی ہے - ہرمن ہسے کے ناول سدھارتا کا ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے تخلیقی ترجمے کی تمام شرائط کو پورا کیا ہے -

اتفاق سے ہم نے یہ مثالیں محض تخلیقی فنکاروں کے ترجموں کی دی ہیں جنھوں نے اردو کے افسانوی ادب میں اپنی تخلیقات سے بھی اضافہ کیا ہے اور جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے اپنے ترجموں کو تخلیقی سطح پر لے آئے ہیں - کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ افسانوی ادب کے تراجم محض تخلیقی فن کاروں کو کرنے چاہییں ؟ ہمارا جواب نفی میں ہے - ہمارا تقاضہ صرف یہ ہے کہ تخلیقی ادب کا ترجمہ بھی تخلیقی سطح کا ہونا چاہیے اور تخلیقی ترجمہ کی اصطلاح ہم نے اسی تقاضے کے تحت استعمال کی ہے - ہمارا خیال ہے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو یوں تو تخلیقی فن کار نہیں ہیں لیکن اپنے وسیع مطالعے کا اعلیٰ ذوق اور بلند تخیل کے باعث تخلیقی فنکاروں کے ساتھ قدم ملا کر چل سکتے ہیں - ایسے لوگ بھی معیاری ترجمے کرسکتے ہیں - شاہد احمد دہلوی اور خواجہ منظور حسین کو ہم ایسے ہی مترجموں میں شمار کرتے ہیں -

rekhta

افسانوی ادب کے تراجم — مسائل اور مشکلات

انتظار حسین

سجاد باقر رضوی نے بہت تندہی سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے یہاں فکشن کے ترجموں کی روایت بہت مضبوط ہے۔ ان کا یہ خیال پاکستان کے رواج کے عین مطابق ہے۔ ہمیں اپنے سب معاملات درست اور اپنی ہر روایت مضبوط نظر آتی ہے۔ اس بارے میں شک کے اظہار کا مطلب ہے منفی رجحان، قنوطیت پسندی لیکن چونکہ ادب کو ہماری قومی زندگی میں کوئی ایسی اہمیت حاصل نہیں ہے اس لیے میں کم از کم اس معاملہ میں بےخوف ہو کر اپنے شک کا اظہار کر سکتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ترجموں کی یہ روایت جس حد تک بھی مضبوط ہے، مختصر افسانے کی حد تک مضبوط ہے ناول کے ترجموں کا حال خاصا پتلا نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیسری دہائی میں اور اس کے آس پاس روسی فکشن کے ترجمے بہت کثرت سے ہوئے۔ ساتھ میں فرانسیسی فکشن کے بھی مختصر افسانوں کی حد تک یہ بات درست ہے۔لیکن ذرا روسی فکشن کی روایت کے نمائندہ ناولوں کو تصور میں لائیے اور سوچیے کہ ان میں سے کتنے ناول ترجمہ ہوئے اور جو ترجمہ ہوئے ان میں ناولوں کا کیا حال بنایا گیا۔ رہا فرانسیسی فکشن سے ترجموں کا معاملہ تو جہاں موپساں کے افسانوں کے ترجمے کر کر کے ڈھیر لگا دئے گئے کتنا اچھا ہوتا کہ فلابیر اور ستاندال کے ناولوں کو بھی اس زمانے میں تھوڑا اور خود اعتنا سمجھ لیا جاتا۔ اگر مغرب سے ہم حقیقت نگاری کا سبق لے رہے تھے تو اچھا ہوتا کہ اس کے بڑے نمونے ہمارے سامنے ہوتے بہر حال چیخوف کے افسانے تو بڑی تعداد میں ترجمہ ہوئے۔ مگر عجب ماجرا ہے کہ ایک طرف اس عہد نے چیخوف کے سامنے زانوئے ادب تہہ

کر رکھا اور دوسری طرف سب سے زیادہ مقبولیت کا شرف کرشن چندر کے افسانے کو حاصل تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد نے چیخوف سے کتنا سیکھا۔ بس اتنا ہی کہ غلام عباس اور بیدی کو رد نہیں کیا۔ باقی وہ دور فریفتہ کرشن چندر کے رنگ سخن پر تھا۔

بہر حال موپساں، چیخوف اور دوسرے ایسے اساتذہ کے اپنے افسانے بھی ترجمہ ہوئے وہ ایک وقت میں اپنا اثر دکھا کر ہوا میں اڑ گئے۔ ہماری روایت کا حصہ نہیں بن سکے۔ رسالوں میں چھپے۔ وہ ان سے ناپید ہوئے تو ان کے ساتھ وہ ترجمے بھی ناپید ہو گئے۔ اب ہمارے لیے یہ محض ایک اطلاع ہے کہ منٹو صاحب نے روسی اور فرنسیسی افسانوں کے ترجمے کر کے ہمایوں کے روسی افسانہ نمبر اور فرانسیسی افسانہ نمبر نکالے تھے۔ ان کا دیدار اب وہی کر سکے گا جو مظفر علی سید کا ذوق تحقیق رکھتا ہو جن بزرگوں نے مختصر افسانوں کے ترجمے کیے وہ گویا نیکی کر کے دریا میں غرق کرتے چلے گئے ہمارے ترجموں کی روایت میں یہ چلن کبھی نہیں رہا کہ رسالوں میں بکھرے ہوئے مال کو کتابی شکل میں یکجا کر کے آئندہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔

مگر شاید یہ بھی میری خوش فہمی ہے کہ اگر یہ بکھرے ہوئے ترجمے کتابی شکل میں یکجا ہو جائے تو آئندہ کے لیے محفوظ ہو جاتے اور ہماری فکشن کی روایت کو مستقل سیراب کرتے رہتے۔ جو ناول ترجمہ ہوئے وہ تو کتابی شکل ہی میں شائع ہوتے تھے۔ یہ ناول اب بازار میں کہاں دستیاب ہیں؟

اس سے بھی ذرا غور کر لینا چاہیے کہ آخر ہمارے مترجم حضرات مختصر افسانے کے ترجمہ پر کیوں اتنے مستعد تھے اور ناول سے کیوں خائف تھے؟ ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ افسانے کے ترجمہ میں انہیں زیادہ کشٹ نہیں کھینچنا پڑتا تھا، ناول کا ترجمہ وقت مانگتا ہے ترجمہ کرنے والے کو پتہ مار کر بیٹھنا پڑتا ہے اور لمبا وقت لگانا پڑتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان مترجموں نے ترجمہ کے لیے ناول کی طرف توجہ دی تھی تو ایسے ناول چنے جو زیادہ ضخیم نہ ہوں اور اگر کسی ضخیم ناول پر ہاتھ ڈال بیٹھے تو اس کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کا خلاصہ کر ڈالا۔

لیکن اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے اور جو شاید زیادہ بڑی وجہ ہے۔ افسانوں کے ترجموں کو اشاعت کی سہولت حاصل رہی ہے ناول کے ترجمے اس سہولت سے بالعموم محروم رہے ادبی رسالے ہر دور میں ہمارے یہاں اچھی خاصی تعداد میں نکلتے رہے ہیں۔ ان رسالوں نے افسانوں کے ترجموں کو چھاپنے میں کبھی قیل و قال نہیں کیا۔ مگر ناول کا ترجمہ اپنی اشاعت کے لیے ایک ناشر مانگتا ہے اور ہمارے یہاں لکھنے والوں کو ناشر ہمیشہ مشکل ہی سے دستیاب ہوا ہے۔ ناول کے ترجمہ پر محنت کرنے والا یہ تو سوچے گا کہ اتنی محنت کرنے کے بعد ترجمہ کے لیے ناشر بھی میسر آئے گا یا نہیں اور یہ کہ اتنی محنت کا کچھ اسے معاوضہ بھی ملے گا یا نہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کو اس قسم کا اطمینان دو ہی صورتوں میں میسر آ سکتا تھا یا تو ناشروں کو سنجیدہ ناولوں کے چھاپنے میں فائدے کی صورت نظر آتی یا ایسے ادارے ہوتے جو اس کام کی اہمیت جان کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ہمارے یہاں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر کبھی ایسا کوئی ادارہ قائم نہیں ہوا۔ ناشروں کو پاپولر ناولوں کی تلاش رہی۔ انہیں کی اشاعت میں انہیں فائدے کی صورت نظر آتی تھی۔ اس مزاج کے ناول البتہ برے بھلے ترجمے یا خلاصہ کی صورت میں بہت شائع ہوئے۔ ہاں ایک زمانے میں مکتبۂ جدید نے مغرب کے سنجیدہ معیاری ناولوں کو قاعدے سے ترجمہ کر کے شائع کرنے کا منصوبہ ضرور بنایا شاید یہ منصوبہ چند سال چلا اور اس کی بدولت درجۂ اول کے کچھ ناول شائع ہو گئے۔ پھر اسی زمانے میں مکتبۂ فرینکلن نے پاکستان میں ان کا کاروبار شروع کیا اس کے واسطے سے امریکی فکشن کے کچھ شاہکار اردو میں ترجمہ ہوکر شایع ہوئے مگر امریکہ کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ پھر اس نے وہ مال جو اچھا تھا باندھ کر الگ رکھا۔ مکتبہ فرانکلن بند ہو گیا۔ بس پھر ادھر سے ہمارے لیے رنگا رنگ ایڈوائزر اور ہی ہی آتے رہے۔ ادھر مکتبۂ جدید کا بھی بستر لپٹ گیا۔ یوں ناولوں کے ترجموں کی جو ایک رو آئی تھی وہ دم توڑ گئی۔

سجاد باقر رضوی کہتے ہیں کہ:

”ہمارا سارا افسانوی ادب داستانوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے مغرب کی دین ہے“

اگر یہی بات ہے تو پھر جو ہوا سو ٹھیک ہوا۔ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہوگا۔ ہم نے سارا زور مختصر افسانے کے ترجمے پر صرف کیا۔ سو مختصر افسانے ہی کی روایت پروان چڑھی۔ ناولوں کے ترجمے ضروری نہیں سمجھے۔ جیسے ٹوٹے پھوٹے ترجمے ہوگئے ویسی ہی ٹوٹی پھوٹی ناول کی روایت چل رہی ہے۔

ایک بات اور جس زمانے میں جس رنگ کے افسانے ترجمے ہوئے اس زمانے میں اسی قسم کے افسانے لکھے گئے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ جو نسل جیسامزاج لیکر آئی تھی اس مزاج کا افسانہ انھوں نے ترجمہ کیا اور اس سے اپنے افسانے کی آبیاری کی۔ نیاز فتح پوری کی نسل رومانی مزاج لیکر آئی تھی اس نے آسکر ڈائلڈ، خلیل جبران، ٹیگور وغیرہ کی نگارشات کو کچھ ترجمہ کیا۔ کچھ بغیر ترجمہ کے سمیٹ لیا اور اپنے رومانی فکشن کو پروان چڑھایا۔ تیسری چوتھی دہائی کے افسانہ نگاروں کی نسل نے حقیقت نگاری کے افسانے سے تربیت حاصل کی۔ مگر جب تجریدی اور علامتی افسانے کا دور شروع ہوا تو ایسا افسانہ لکھنے والوں نے تربیت حاصل کرنے کے لیے کتنا تردد کیا۔ ترجموں کا عمل اس مرحلہ میں آکر سست پڑتا نظر آتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر اس زمانے میں آکر کا فکا کے ناول اور افسانے اردو میں ترجمہ ہو گئے ہوتے، تو اردو کے نئے افسانے کے سلسلہ میں کیا فرق پڑتا۔ دیکھیے صاحب ترجموں کا عمل تو ایک تربیتی کورس ہوتا ہے، لکھنے والوں کے لیے بھی اور پڑھنے والوں کے لیے بھی جب حقیقت نگاری کے افسانے کے زمانے میں مغرب کا حقیقت نگار افسانہ ترجمہ ہو رہا تھا تو اس سے افسانہ لکھنے والا بھی برا بھلا کچھ سیکھ رہا تھا اور اردو قارئین کی بھی تربیت ہو رہی تھی۔ اس تربیت کے طفیل انھوں نے منٹو، بیدی اور غلام عباس کے افسانوں کو سمجھا اور پسند کیا۔ مگر تجریدی علامتی افسانے کے زمانے میں اس قسم کا کوئی تربیتی کورس نہیں ہوا۔ اردو کے قارئین تو تیسری چوتھی دہائی کے تربیت یافتہ تھے۔ نئی تربیت انھیں ملی ہی نہیں۔ اس لیے انھیں تجریدی علامتی افسانہ مہمل ہی نظر آتا تھا۔ لکھنے والے کی بھی مناسب تربیت نہیں ہوسکی۔ ان لکھنے والوں نے کافکا کو ترجمہ کرنے کا کشٹ کھینچ لیا ہوتا تو کم از کم انھیں اتنا تو احساس ہو جاتا کہ تجریدی علامتی افسانہ شاعری بگھارنے کا نام نہیں ہے۔

کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کام کے لیے ترجمہ کرنا کیا ضروری ہے۔ جس لکھنے والے سے یا جس طرز کے افسانے سے آپ فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں ایسے ٹھکانے سے پڑھ ڈالیے۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ لیکن جب ہم کسی افسانے یا ناول کا ترجمہ کرتے ہیں تو جس طرز اظہار سے وہ متصف ہے اس کے سارے نشیب و فراز سے ہم گزرتے ہیں۔ لکھنے والے کو اظہار میں جن مشکل مقامات سے گزرنا پڑا ہے اور جس طرح ان پر اس نے عبور پایا ہے انھیں ہم اتنا قریب سے دیکھتے ہیں کہ وہ سب کچھ ہمارے شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ سجاد باقر رضوی نے کہا ہے کہ:

"ایسی صورت میں دو تہذیبیں ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتی۔ ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے"

اس بیان کے دوسرے حصے پر بعد میں آؤں پہلے ٹکڑے میں اتنا اضافہ کروں گا کہ ایسی صورت میں دو تہذیبیں ہی نہیں دو نثری روایتیں بھی ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتی ہیں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نثری روایت کا ذائقہ ترجمے میں ضائع نہ ہو جائے اور اس نثری روایت کے اندر لکھنے والے کا جو اپنا ایک اسلوب ہے وہ بھی جس حد تک منتقل ہو سکتا ہے منتقل ہو جائے۔ یہ بات بہت کہی جاتی رہی ہے کہ ترجمہ ایسا ہونا چاہیے کہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ مگر ترجمہ کیوں نہ معلوم ہو۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری نثر کا ایک اجنبی نثر سے پالا پڑا رہے۔ اگر ترجمہ کرنے والے نے ترجمہ کرتے ہوئے غیر نثر کا ذائقہ بالکل گم کر دیا اور مصنف کے اسلوب کو بھی اپنی روانی میں غیر بوت کر دیا تو اس شاہکار کا تو بھرتا کیا ہی اپنی زبان کو اور اپنے شعور نثر کو بھی کیا فیض پہنچایا؟ اچھے فکشن کے ترجمہ کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس زبان کی نثر میں جو بیان کے پیرائے ہیں، ان کے اپنے ہاں منتقل ہونے سے اپنی نثر کے اظہاری ممکنات میں توسیع پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر ترجمہ یوں کیا جائے کہ ناول کا خلاصہ کر دیا جائے اور ترجمہ ترجمہ نظر نہ آئے تو پھر ایسے ترجمہ کا فائدہ کیا ہے۔ ہاں ترجمہ ان ترجمہ بھی نظر نہ آئے کہ غضور جالندھری کا ترجمہ بن کر رہ جائے غضور جالندھری نے تو ترجمے اس طرح کیے ہیں کہ ایک ہی وار میں دونوں زبانیں گھائل ہو جاتی ہیں۔

ہماری اردو بھی اپنی جان سے چلی جاتی ہے اور مصنف کی زبان و بیان کے رنگ و بو کا بھی پتہ نہیں چلتا۔

مگر سجاد باقر رضوی کہتے ہیں کہ ترجمے میں "ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے"۔ ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنے کی مساعی جمیلہ دیکھنی ہوں تو قدیم ہند کی داستانوں کے پرانے اردو ترجمے دیکھیے۔ مثلاً شیو پران کے ترجمے کی ایک جھلک دیکھیے مہا دیوجی کی شان میں:

انھیں سے گرم ہے بازار بخشش
رواں ہے قلزم ذخار بخشش

بظاہر باطن و ظاہر وہی ہے
ہوالاول ہوالآخر وہی ہے

نہاں ہے پردۂ اسرار میں وہ
عیاں ہے ہر در و دیوار میں وہ

دیکھیے مترجم نے مہادیوجی کی مداح و ثنا کو حمد باری تعالیٰ بنا دیا۔ آگے دیکھیے:

کہا پیلادنے اے دیو پرفن
وہی ہے ہر جگہ پر جلوہ افگن

بشر میں دیو میں جن و ملک میں
مہ تاباں میں خورشید فلک میں

دیکھا مترجم نے کس خوش اسلوبی سے ہندو دیو مالا میں ملائکہ کو داخلہ دلادیا ہے۔ مہا بھارت کے ایک مترجم نے اس دیو مالا میں لوح و قلم کے تصور کو بھی سمو دیا ہے:

نگارندۂ نقش لوح و قلم
خداوند ملک حدوث و قدم

علیم و خبیر و سمیع و بصیر
کریم و رحیم و غفور و قدیر

رامائن کے ترجمہ کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجیے - رائے سدھ ناتھ بلی فراتی نے والمیک جی کی رامائن کا ترجمہ کیا ہے - مشتے نمونہ از خر وارے - سیتاجی کے اغوا کا ایک شاہد منگربو ہے - بیان کرتا ہے کہ :

سیتا نظر پڑیں ہمیں باگریہ وفغاں
قابو میں غیر کے سر افلاک تھیں رواں

ہم لوگوں کو جو دیکھا تو اتنا پتہ دیا
حضرت کا نام لے کے دوپٹہ گرا دیا

یہ کہہ کے جلد لایا دوپٹہ وہ خوش سیر
شہ آب دیدہ ہو گئے اک بار دیکھ کر

بولا وہ شہ سے آپ نہ غمگین ہوں اس قدر
تعمیل حکم کے لیے حاضر ہوں سر بہ سر

کب میرے حق میں ہوتا ہے ارشاد اے حضور
دوں گا میں ہر طریق سے امداد اے حضور

دیکھا ایک تہذیبی سانچہ کو دوسرے تہذیبی سانچہ میں کس کمال سے منتقل کیا ہے کہ والمیک جی کی رامائن میر انیس کا مرثیہ بن گئی - مترجم نے اس جگہ میں سیتاجی کو دوپٹہ بھی اڑھوا دیا - مگر اس عمل میں والمیک جی کہاں گم ہو گئے اور رامائن کی خوشبو کیسے اڑ گئی -

اب سوچیے کہ اگر سجاد باقر رضوی کے اس نسخہ کے مطابق عسکری صاحب مادام بواری کا ترجمہ کرتے تو سب سے پہلے تو اس بی بی کو دوپٹہ اوڑھنا پڑتا - باقی غرارہ نہیں تو شلوار ضرور پہنی پڑتی - پھر مادام بواری ہمیں آپ کو کیسی لگتی - ویسے رفیق خاور نے ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کا ترجمہ اسی نسخے کو کام میں لاتے ہوئے اس طرح کیا کہ نظم میں کارتھیج کا حوالہ آیا تو اسے کانویں واڑ بنا دیا اور ٹیمز کا ذکر آیا تو اسے جمنا ندی بنا دیا -

بہر حال یہ مشکلات افسانوی ادب کے ترجمے کی حد تک ہیں - جہاں تک علوم کے ترجمہ کا سوال ہے تو سجاد باقر رضوی نے صحیح کہا کہ وہ معاملہ نسبتاً آسان ہے - اگرچہ شور زیادہ وہیں مچایا گیا ہے

کہ صاحب اردو میں علوم کا ترجمہ بہت مشکل ہے - مگر عسکری صاحب نے یہ کہا کہ :

"شاید اردو میں کانٹ کا ہر خیال پوری صحت کے ساتھ منتقل ہو جائے لیکن اگر کوئی صاحب پروست کا ایک جملہ اردو میں ٹھیک ترجمہ کرکے دکھائیں تو میں اردو کو دنیا کی سب سے بڑی زبان مان لوں گا"۔

اصل میں علوم کا ترجمہ کرنے والوں نے تو اپنے راستہ میں خود کانٹے بو رکھے ہیں - بیٹھتے ہیں اردو میں اور ٹانگ توڑتے ہیں فارسی اور عربی کی علمی وقار پیدا کرنا مقصود ہو تو اور بات ہے ورنہ کیا ضرور ہے کہ اصطلاح کا ترجمہ ہمیشہ اتنا معرب اور مفرس ہو کہ اس کا حلق سے نیچے اترنا دشوار ہو جائے - پھر جو اصطلاحیں انگریزی میں چل پڑی ہیں ان کا ترجمہ کرنے کی کیوں زحمت اٹھائی جائے - مثلاً کیا تکلیف ہے کہ ایٹم کو جوہری بم کہا جائے مگر خیر یہ مضمون دوسرا ہے مجھے تو افسانوی ادب کے ترجمے کے مسئلہ تک محدود رہنا چاہیے -

ادبی تراجم کے مسائل

شان الحق حقی

انسانی معاشروں کی رنگا رنگی میں زبانوں کا اختلاف بھی رنگ و نسل کے اختلاف کے ساتھ ہی ساتھ نمایاں ہے اگرچہ رنگ و نسل کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں۔ آج کی دنیا میں ایک ہی نسل کے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں اور بعض صورتوں میں ایک ہی زبان کئی نسل کے لوگوں میں بولی جاتی ہے۔ تاہم زبانوں کی ابتدائی تقسیم نسلی تقسیم سے مطابقت رکھتی تھی۔ جوں جوں نسلیں وسیع جغرافیائی علاقوں میں پھیلتی گئیں ان کی زبانوں میں بھی تنوع پیدا ہوتا گیا جو طبعی ماحول مرور زمانہ اور دوسرے معاشروں سے اختلاط کا نتیجہ تھا۔ علاوہ ازیں زبان فطرتاً تغیر پذیر شے ہے۔ یہ ایک ہی مقام پر ایک ہی معاشرے میں رہ کر بھی بدلتی رہتی ہے۔ مختلف حرفوں اور پیشوں کے لوگ اپنی اپنی اصطلاحوں میں بات کرتے ہیں۔ مخارج، لہجے اور مذاق کا اختلاف قوموں اور خطوں سے گزرکر خاندانوں بلکہ افراد پر آکر ٹھہرتا ہے۔ ہر فرد کے اعضائے لسانی دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ فرق نہ صرف آواز کی انفرادیت میں ظاہر ہوتا ہے جو صرف پہنچانی جاتی ہے، بلکہ لہجے، لحن، انداز گفتار، رفتار گفتار تقریر کے اتار چڑھاؤ اور انتخاب الفاظ میں بھی موجود ہوتا ہے اور یہی سے اختلاف لسانی کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس کی اساس انسانی خلقت پر ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے اسے مظاہر قدرت میں شامل کیا ہے۔

و من ایات اللہ خلق و السماوات والارض و اختلاف و السنتکم و الوانکم ٭ (سورۃ روم، ۲۲)

(آسمان و زمین کی خلقت اور تمہارے زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اللہ کی آیات میں سے ہے۔)

آیات کا لفظ قرآن شریف میں ان مظاہر فطرت کے لیے آیا ہے جو انسانی قدرت سے باہر صرف اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تابع ہیں، جیسے دن اور رات کا بدلنا اور جملہ قوانین فطرت جو کائنات میں جاری و ساری ہیں۔

نسلی و لسانی اختلاف کے باوجود انسانیت ایک نوع سے تعلق رکھتی ہے۔ معروف محاورے میں، اس کا خمیر ایک ہی مٹی سے بنا ہے۔ اس کی جبلی خصوصیات، احتیاجات، جذبات ان سب میں اختلاف سے زیادہ اتحاد ملتا ہے۔ نفسی ترکیب ایک طرح کی ہے۔ انسانوں کو ایک ہی طرح کا ذہن ملا ہے جس میں تخلیقی صلاحیت بھی شامل ہے یہ اور بات کہ ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع ہر فرد کو یکساں حاصل نہ ہوں اور تاریخ کے کسی لمحے میں کوئی معاشرہ کسی لحاظ سے آگے اور کوئی پیچھے ہو۔ بعض ایسے معاشرے بھی ہیں جن میں تہذیبی ترقی کی رفتار ایک نقطے پر ٹھہر گئی ہے۔ غور کیجیے تو زمانہ حال میں سابقہ تمام تہذیبی ادوار کے مرقع ہمارے سامنے کھلے ہیں جنہیں قدرت نے غالباً ہماری عبرت و بصیرت کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن قدیم قبائل میں بھی اور کچھ نہ سہی، ایک خاصی ترش ترشائی زبان ضرور موجود ہے اور کچھ گیت بھی جنہیں ادبی تخلیق کی طرف پہلا قدم کہنا چاہیے۔

علاوہ ازیں زبان میں صوتیات، ترکیب نحوی، لغات، لہجے اور محاورے کے اختلاف سے قطع نظر کلمے کی بنیادی تقسیم کم و بیش ملتی جلتی ہے، یعنی جملہ کلمات اسم، فعل اور حرف پر مشتمل ہوتے ہیں، خواہ صرفی و نحوی قواعد مختلف سہی۔ لیکن اصل چیز انسانی تصورات ہیں اور الفاظ ان کے قائم مقام۔ تصورات کسی قوم کے تجربات، مشاہدات اور تخیلات پر مبنی ہوتے ہیں اور ان سب کا خلاصہ اس کے ادب میں ملتا ہے۔ علم و ادب انسان کی مشترک میراث ہیں کیونکہ دونوں نوع انسانی کے لیے ذریعہ بصیرت ہیں اور تہذیبی ترقی انہی سے عبارت رہی ہے۔ انسانی تہذیب نے باہمی لین دین کے ذریعے فروغ پایا ہے اور یہ تراجم ہی کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔

ادبی تراجم کا سلسلہ مذہبی تراجم سے شروع ہوا۔ مذہبی صحائف عالمی ادب کا ایک اہم حصہ ہیں اور ہر زبان کے اعلیٰ ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ اکثر انہیں ناقابل ترجمہ بھی خیال کیا جاتا رہا ہے۔ بعض

اوقات ان کے ترجمے کی کوشش کو ایک طرح کی بے حرمتی بھی کہا گیا۔ انگلستان میں بائبل کے انگریزی ترجمے کی سختی سے مخالفت ہوئی۔ چنانچہ اولین انگریزی ترجمے چوری چھپے انگلستان سے باہر چھاپے گئے اور ان کی درآمد پر پابندی رہی۔ ہمیں خود بھی قرآن شریف کے ترجموں کی طرف بے رغبتی رہی ہے اور ناظرہ پڑھنے ہی کو کافی سمجھتے رہے ہیں۔ ہمیں یہ آسانی تھی کہ ہمارا رسم الخط، بقول مہاتما گاندھی قرآنی رسم الخط تھا۔ لیکن اس صورت میں کہ اصل زبان اور اس کا رسم الخط عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہو یا جو زبان متروک ہوگئی ہو، تراجم سے کام لیے بغیر چارہ نہیں عبرانی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر مختلف زبانوں میں انجیل مقدس کے تراجم لازم آئے۔ دنیا کے بڑے مذاہب جو ساری انسانیت کے لیے ہیں ان کا منشا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے صحائف سے صرف ایک محدود گروہ ہدایت پائے اور وہ باقی دنیا کی پہنچ سے باہر رہیں۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ اصل زبان سے بیگانگی کی صورت میں اہل عقیدت کو ترجمے کے ساتھ ویسا ہی لگاؤ پیدا ہوگیا جیسا کہ اصل سے تھا اور اس میں وہ سب محاسن نظر آنے لگے جو اصل سے منسوب تھے۔ چنانچہ انگریزی بائبل کا "مصدقہ" ایڈیشن جو ۱۶۱۱ء سے مروج چلا آرہا ہے ایسی ہی خوش عقیدگی سے پڑھا جاتا ہے جیسے کہ وہ اصل بائبل ہو اور ادب عالیہ میں تو اس کا شمار ہے ہی۔ اس صدی میں بائبل کے کچھ ترجمے زمانہ حال کے محاورے میں البتہ شائع ہوئے ہیں، ورنہ تمام انگریزی ادب اسی قدیم ایڈیشن کے اقتباسات اور اس کی طرف تلمیحات سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے فقرے جزو زبان ہو گئے ہیں۔ اس کا رتبہ صحیفہ آسمانی سے کم نہیں۔ یہی بات دوسرے مذاہب کے صحائف کی بابت بھی کہی جاسکتی ہے۔ تلسی داس کی رامائن اور بھگوت گیتا میں رام چندر جی اور شری کرشن کے اقوال کو حرفاً حرفاً صادق مانا جاتا ہے۔ بدھ مت کی "دھم پد" بھی ہر زبان میں اصلی سمجھی جاتی ہے۔ مذہبی لٹریچر کا اپنا ایک مقام ہے۔ یہ انسانوں کی مخصوص ضروریات کو پورا کرتا ہے جو نہ صرف جذباتی ہیں بلکہ عملی پہلو بھی رکھتی ہیں اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ادب عالیہ میں شامل ہیں۔ ادب کا مطالعہ علی العموم جن فوائد کا حامل ہے جو سب ادبی تراجم میں مقصود و متصور ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ان کے تجاوز بھی ہیں۔

یعنی ادب کو ہم جدا جدا خانوں میں رکھ کر نہ دیکھیں بلکہ اس پر ایک عالمگیر حقیقت کے طور پر نظر کریں تو یہ علم انسانی کا ایک وقیع حصہ اور فکر انسانی کے لیے ایک اہم موضوع بھی ہے جو مختلف پہلوؤں سے مطالعہ اور مشاہدے کی دعوت دیتا ہے۔ خصوصاً تاریخی، عمرانی اور لسانی پہلوؤں سے تحقیق و تفکر کا ایک اہم میدان ہے۔ یورپ میں پچھلی صدی کے اوائل سے ادب کے تقابلی مطالع کی بنیاد پڑی اور اس نئے مضمون کو کئی طرح کے نام دئے گئے۔ "عمومی ادب" (جنرل لٹریچر) تشریح الادب "(اناٹومی آف لٹریچر)" "تقابلی ادب" وغیرہ۔ گوئٹے نے اسے (Wetliterature) "عالمی ادب" کہا اور خود بھی مشرقی ادب کا مطالعہ کیا۔ بہت سے اور مستشرقین نے بھی ادب کے تقابلی مطالعے کی طرف توجہ کی۔ لیکن ہمیں البیرونی کو نہیں بھلانا چاہیے جس نے بہت پہلے سنسکرت ادب اور اس کے ساتھ پوری ہندی معاشرت افکار و عقائد، علوم و رسوم کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور یہی تقابلی مطالعے کا مقصود و مفہوم ہے۔

دراصل بات اس سے بھی آگے تک جاتی ہے۔ ایک برگزیدہ کام جو قدرت نے انسان کے ذمے کیا ہے وہ حقیقت کی تلاش اور کائنات کا مطالعہ ہے ہستی کے گورکھ دھندے کو سلجھانا اور کائنات کے رازوں کو پانا۔ ادب بھی تلاش حقیقت میں دوسرے علوم انسانی کا تعاون ہے۔ اقبال نے اسی جستجو کی بابت کہا تھا:

ع کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یوں تو ادب کے بہت سے مدارج ہیں، اعلیٰ بھی ادنیٰ بھی اور اس کی تعریف میں بہت کچھ آجاتا جو کسی سطح پر بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں، لیکن اپنی اعلیٰ تر شکل میں یہ اس خلش جستجو کی پیداوار ہے جو شرف انسانی ہے:

"شاعری جو منطق کی میزان کے بغیر حقائق کو جانچ لیتی ہے ... اور حقیقت پر اتنے مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالتی ہے کہ کبھی کبھی خود اپنے مشاہدے کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ..... ذہن انسانی کا کام حقیقت کے اسی متحرک، متنوع اور ناقابل تسخیر تصور کا

مسلسل تعاقب کرتا ہے اور شاعری بھی اسی کوشش میں معاون ہے جس طرح شعوری مشاہدہ حقیقت کے درباز کرتا ہے، فن کا متحرک تخلیقی عمل بھی جو تصورات پیدا کرتا ہے، وہ حقیقت سے خارج نہیں کہے جا سکتے، بلکہ میرا خیال ہے کہ تخیل (وجدان) کی آمیزش سے اس میں ایک جہت اور بڑھ جاتی ہے''۔

یہ اقتباس میں نے اپنے ہی ایک سابقہ مضمون سے نقل کیا ہے، یعنی میرے پہلے مجموعۂ کلام ''تارپیراہن'' کا مقدمہ (۱۹۵۸ء) اس مجموعہ میں ایک باب تراجم کا بھی تھا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے بہت سے ترجمے کیے ہیں۔ نثری ادب کے تراجم میں امریکی ناول نگار جیک شافر کے ناول ''شین'' کا ترجمہ ''انجان راہی'' (۱۹۵۷ء) اور منظوم تراجم میں شیکسپیئر کے سب سے طویل ڈرامے اینٹنی کلیوپٹرا کا ترجمہ قہر عشق (تمثیل بصورت ابیات) اور منتخب عالمی ادب کے تراجم ''درپن درپن'' شامل ہیں۔ ان تراجم کے سلسلے میں مجھے ادبی تراجم کے مسائل سے براہ راست واسطہ پڑا۔ ان کے بارے میں میرے تاثرات کچھ ذاتی تجربے اور کچھ عمومی مطالعے پر مبنی ہیں۔ اردو کے کلاسکی ادب کا بڑا حصہ تراجم پر مشتمل ہے، خصوصاً نثری ادب کی ابتدائی تراجم سے ہوئی سب رس کربل کتھا، نو طرز مرصع باغ و بہار آرائش محفل یا تو تمام تر ترجمے ہیں یا فارسی سے ماخوذ۔ مغربی زبانوں سے پہلا ترجمہ ریورنڈ شلٹز کا کیا ہوا بائبل کا ترجمہ بتایا جاتا ہے اور بائبل دوسرا ترجمہ غالباً فطرت لکھنوی کا تھا جو فورٹ ولیم کالج کے لیے کیا گیا۔ خود جان گلکرسٹ نے اپنی کتاب ''ہندوستانی زبان کے قواعد'' کو شیکسپیر کے بعض اقتباسات کے اردو تراجم سے مزین کیا۔ اس کے بعد سے آج تک تراجم کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا ہے۔ منظوم تراجم کا ایک خاصا مبسوط انتخاب کوئی دس جلدوں میں حیدر آباد دکن سے والا اکیڈمی نے ''ساز مغرب'' کے عنوان سے شائع کیا ہے جسے جناب حسن الدین احمد نے بڑی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ لیکن نظموں کے اس انتخاب کو بھی مکمل نہیں کہہ سکتے۔ بہت سے ترجمے تو نا پید ہی ہو گئے ہیں۔ تراجم سے قطع نظر مترجمین کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ یہ تراجم لا محالہ مختلف انداز کے ہیں۔ ایک ایک نظم کے کئی کئی ترجمے بھی ہیں جن سے ظاہر

ہوتا ہے کہ ترجمہ میں خود مترجم کی شخصیت کا کتنا دخل رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر ''ساز مغرب'' کی جلد دوم میں ''آندھی، نابینا پھول والی کا گیت'' کے عنوان سے لارڈلٹن کی نظم کے پانچ مختلف تراجم ہیں۔ مترجمین میں محمد حسین آزاد سرور جہان آبادی سید محمد ابراہیم رشک، اشک بلند شہری اور احسن لکھنؤی۔ ان نظموں میں بحر و آہنگ اور نظم کی ہیئت سے لے کر مضامین و تخیلات تک ہر طرح کا اختلاف موجود ہے۔ ہر شاعر نے نظم کو اپنے طور پر ڈھالا ہے۔ نظم طویل ہے۔ نمونۃً صرف پہلے شعر کو دیکھیے:

لوگو میرے پھول خریدو
کہتی ہوں عجز سے پھول خریدو

(محمد حسین آزاد)

لوگو چلو مرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

(سرور جہان آبادی)

میں پھول بیچنے لائی ہوں لو، پریزادو
بن آنکھوں والی سے ان کو نجات دلوادو

(سید محمد ابراہیم اشک)

خریدو پھول میرے لینے والو
ذرا ان کی بہاروں کا مزا لو

(اشک بلند شہری)

گو وہی مالن کی ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول

(احسن لکھنوی)

اسی طرح اور بھی نظموں اور پوری کتابوں کے کئی کئی تراجم کیے گئے ہیں اور ان میں انداز اور طریق کار کا بڑا تنوع ملتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مغربی زبانوں سے اردو میں سائنسی اور فنی کتابوں کے تراجم کی تعداد ادبی کتابوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ پچھلی صدی تک تو علوم و فنون ہی پر زیادہ زور رہا۔ طبعیات کیمیا ہندسہ ہیئت میکانیات

طب مغربی ، فلسفہ فلکیات ، تاریخ ، جغرافیہ ، سوانح اور علوم جدید کی مختلف شاخوں پر بے شمار کتابیں ترجمہ ہو کر اردو میں آگئیں ۔ اس میں نواب شمس الدولہ ، دربار اودھ ، دہلی کالج ، رڑکی کالج ، آگرہ میڈیکل کالج، سائنٹیفک سوسائٹی کے علاوہ انفرادی کوششیں بھی شامل تھیں اور ادبی تراجم تو بیشتر انفرادی ذوق کاوش ہی کا نتیجے تھے ۔ ''تمدن ہند'' اور ''تمدن عرب'' از سید علی بلگرامی اسکی اعلیٰ مثالیں ہیں ۔ نیز مولانا ظفر علی خاں کے کیے ہوئے ''معرکہ مذہب سائنس'' اور رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں کے ترجمے معیاری ترجمے ہیں ۔

ادبی تراجم کے سلسلے میں پہلا مسئلہ ، جسے مترجمین نے اکثر ملحوظ نہیں رکھا ، مقصد کا تعین ہے ۔ ترجمے کی غایت دو طرح کی ہو سکتی ہے ۔ ایک علمی یا مکتبی(Academic) اور خالص ادبی ۔ پہلی قسم کا ترجمہ آپ کو اصل ادب پارے کے موضوع و مفہوم ، بہت مفاہیم ، افکار و تخیلات سے متعارف کرا سکتا ہے اور اسکی بابت بہت کچھ بتا سکتا ہے ، لیکن بجائے خود ادب پارہ شمار نہیں ہو سکتا اور وہ ادب پارہ ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرے گا ۔

دوسری غایت ادبی ہو سکتی ہے ۔ یعنی اپنے ادب میں اصل ادب پارے کا جواب پیدا کرنا جو بجائے خود ایک ادب پارہ اور اس زبان کے ادب میں ایک اضافہ سمجھا جائے جس میں ترجمہ کیا گیا ۔ جیسا کہ پروفیسر کرار حسین نے لکھا ''ادب ایک باغ کی طرح ہے جس میں رنگ رنگ کے پودے ہوتے ہیں'' اور حاشیے پر دوراس کے پودوں سے بھی گلکاری کی جا سکتی ہے ۔ (مقدمہ قہر عشق)

پہلی قسم کی مثال میں مولوی عنایت اللہ دہلوی کے تراجم سرفہرست ہیں جنہوں نے مغربی ادب کے بہت سے چند شاہکار اور شیکسپئر کے غالباً سبھی ڈرامے اردو میں ترجمہ کر ڈالے بلاشبہ بڑی علمی خدمت انجام دی ہے لیکن ان کے تراجم میں ادبیت یا تخلیقی شان پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ شیکسپئر کے ڈراموں میں تمام کردار ایک ہی لہجے میں بات کرتے ہیں جسے تراجم کا اپنا لہجہ کہا جا سکتا ہے ، الف سے ی تک پوری کہانی ، کردار مکالمات میں موجود ہیں ، صرف شاعری نہیں ۔ یہاں

رابرٹ فراسٹ کا یہ مقولہ یاد آتا ہے کہ ترجمے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے وہی شاعری ہے ۔

علمی افادی یا یکتی قسم کے تراجم میں اختر حسین رائے پوری کے کیے ہوئے نذر الاسلام کے ترجمے بھی گنے جا سکتے ہیں ، جنہوں نے اردو دنیا کو نذرالاسلام کی شاعری سے صحیح معنی میں روشناس کرایا اور بہت سے تخلیقی ذہنوں کو چونکا کر ایک نئی راہ سمجھائی ۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری میں انہی تراجم کے بعد ایک نیا موڑ آیا ۔

دوسری قسم بھی ادبی تراجم میں نیاز فتحپوری کے کیے ہوئے ٹیگور کے ترجمے اگرچہ منثور تھے اور خود شاعری نہ بن سکے ، لیکن ان سے بھی ایک نئے طرز نگارش کی طرح پڑی ۔ ادبی تراجم میں نثری ادب کے بہت سے عمدہ ترجمے ہوئے سربرآوردہ مترجمین میں مجنوں گورکھپوری ، شاہد احمد دہلوی عبدالمجید سالک ، عزیز احمد ، غلام عباس، اختر حسین رائے پوری ، قاضی عبدالغفار صرف چند نام ہیں ۔ نثری ادب کے بہت سے تسلی بخش ترجمے ہوئے ہیں ۔ کیونکہ نثر کو نثر میں ڈھال دینا وہ مسائل پیدا نہیں کرتا جو نظم کو ترجمہ کرنے کی صورت میں پیش آتے ہیں ۔ نظم کو نثر بنا دینے سے اس کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور تاثیر کم ہو جاتی ہے ۔ نظم بے تاثیر ہو تو قبیح کہلائے گی اور ادبی قدر و قیمت کھو بیٹھے گی ۔ پھر بھی نظم کا ترجمہ نظم میں آرا دشوار ہے تو نظم کا ترجمہ نثر میں میرے نزدیک محالات سے ہے کہ وہ جنس ہی اور ہو جاتی ہے ۔ افادیت ہو تو ہو ادبیت باقی نہیں رہتی ۔

ترجمے کی غایت متعین ہو جانے کے بعد اگر علمی یا افادی ترجمہ مقصود ہو وہ دو طرح کا ہو سکتا ہے ۔ اگر کم و بیش لفظی، دوسرا وہ جس میں محاورہ بدل جائے ۔ نثری ترجمے میں اصل محاورے کی ترجمانی بھی اپنی جگہ ایک افادی پہلو رکھتی ہے ، خصوصاً ان اہل علم کے لیے جو تقابلی لسانیات سے دلچسپی رکھتے ہوں ۔ لیکن ایک صورت یہ بھی ہے کہ عبارت تمامتر اپنے محاورے میں ڈھال لیا جائے ۔ کون سا طریقہ موزوں ہو گا یہ کتاب کی نوعیت پر منحصر ہے ۔ لفظی ترجمے کی ایک موٹی سی مثال مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا عبدالقادر کے کیے قرآن شریف کے ترجمے میں جن کی تحریر پر عربی نحو کا اثر غالب ہے ۔ چنانچہ اردو کی

ترکیب نحوی میں الٹ پلٹ ہوگئی۔ جن ارادات کی بنا پر وہی انداز ایک عرصے تک قبول کیا جاتا رہا اور لوگ اسی ترجمے کو خشو و خضوع کے ساتھ پڑھتے رہے، جیسے کہ قدیم بائبل کی متروک زبان آج تک مقبول چلی آ رہی ہے۔ اب سے ۵۵/۶۰ برس پہلے ملارموزی نے اپنے مزاحیہ مضامین ”لکات رموزی“ میں اس انداز کی پروڈی کی تو لوگوں نے اس سے خاصا لطف لیا، لیکن بعض حلقوں میں اس پر ملامت بھی کی گئی۔ قرآن مجید کے جو ترجمے اردو کے متداول محاورے میں ہوتے وہ زیادہ مقبول ہیں۔ مگر ان میں بھی انداز کا اختلاف موجود ہے۔ مثلاً مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمہ قرآن میں ایسے محاورات کو راہ دی جو علمی تحریر سے میل نہیں کھاتے۔ یہاں بھی ترجمے کی غایت اور مترجم کی شخصیت دونوں عوامل کر رہے ہیں۔ مرآۃ العروس کے مصنف کا ایک خاص مقصد خواتین کی تہذیب و تربیت تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ زبان گھریلو خواتین کے لیے زیادہ مانوس اور قابل فہم ہوگی جو روزانہ قرآن پڑھتی ہیں۔

ترجمے کی غایت اگر علمی و افادی کے بالمقابل ادبی و تخلیقی ہو تو اس کے لیے پہلی شرط وجدانی تحریک ہے، دراصل یہ تخلیق سے زیادہ دشوار عمل ہے۔ تخلیق میں تو فکر آزاد ہوتا ہے اور ترجمے کی صورت میں اصل کے ساتھ رشتہ بنا۔ بعض ترجمے اس لیے کامیاب نہیں ہوتے کہ وہ علمی و ادبی غایت کو غلط ملط کر دیتے ہیں۔ ذہن کو تخلیق کی بجائے ترجمانی پر لگاتے ہیں۔ یہ خالصتہً ایک ذہنی کاوش ہوتی ہے۔ ترجمہ جبھی کامیاب ہو سکتا ہے کہ اصل نظم شاعر کے ذہن میں رس بس جائے وہ اسے واقعی اپنا لے اور پھر اپنے الفاظ میں نئے سرے سے تخلیق کرے۔ اسے اصل کا چربہ نہ کر سکیں تو اس کا مثیل کہہ سکیں۔ فھوا لمراد۔

ادب، خصوصاً شاعری الفاظ کا فن ہے، لیکن لفظ عدد کی طرح ایک صرف ایک غیر مشخص تجریدی علامت نہیں ہوتا اپنی ایک شخصیت رکھتا ہے۔ اس کی اپنی ایک سرگزشت اور رشتے ناتے ہوتے ہیں، اپنا ایک وزن اور صوتی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ایڈورڈروی کارپنٹر کا جواب شاید احمد بڑھئی ہو سکے جو اتنا ہی ہنرمند ہو، لیکن کارپنٹر کا جواب بڑھئی نہیں ہو سکتا۔ مفعولن فعل کا ہم قیمت نہیں اور وزن کا یہ فرق، اختلاف کا صرف ایک خفیف پہلو ہے۔ پھر زبانوں میں جس قدر لسانی اور ثقافتی بعد

ہوگا، ترجمہ اتنا ہی دشوار تر ہوگا۔ دراصل تراجم کے ذریعے اچھے ادب کا تبادلہ سب سے زیادہ اطمینان بخش طور ہماری پاکستانی زبانوں کے درمیان ہو سکتا ہے جو آپس میں ہم رشتہ ہیں اور مشترک لغات و محاورات و امثال کے علاوہ ان کی ترکیب نحوی بھی بڑی حد تک مماثل یا مشترک ہے۔

اس کے برخلاف انگریزی میں ترکیب نحوی الٹ جاتی ہے۔ سبجیکٹ اور پریڈیکیٹ کہیں کے کہیں جا پڑتے ہیں۔ صوتیات اور عروضی نظام الگ ہے۔ ان دشواریوں کی بنا پر بعض مصنف ترجمے کی نئی تشکیل adaptation کا طریقہ اختیار کرتے ہیں جن میں کردار ماحول جزئیات بدل جاتی ہیں مگر ترجمہ کی غایت علمی ہو یا ادبی، اسے گمراہ کن نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ترجمہ ہے یا صرف اخذ و اکتساب۔

اردو نظموں کے انگریزی تراجم میں دو روشیں ملتی ہیں:
”کم و بیش لفظی ترجمہ، نظم کا نثر میں۔ اس کی ایک مثال...... کے کیے ہوئے غالب کے خالص لفظی ترجمے ہیں جیسے کہ اس شعر کا ترجمہ:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

Cognizance may spread the net of hearing to any existent,
The purpose of the Universe of my thought is phoeinx.

یہ نہ علمی حیثیت سے مفید ہے نہ ادبی حیثیت سے بلکہ لفظ کی جگہ لفظ کا انتخاب بھی نا درست ہے۔

دوسری زیادہ معقول صورت وہ ہے جہاں الفاظ کی صرف اسی حد تک پیروی کی جائے کہ وہ مناسب حدود میں رہے، کلام کو بے معنی اور بھونڈا نہ بنائے۔ اس لحاظ سے رالف رسل اور خورشید الاسلام کے کیے ہوئے غالب کے تراجم بہتر ہیں، مثلاً:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

This was not to be my fate, that all should end in lovers meeting,
Even had I gone on living I should still be waiting, waiting.

یہاں میں فٹزجیرالڈ کی رباعیات عمر خیام کا ذکر کروں گا جنہوں نے یورپ میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ یہ بعینہٖ اصل رباعیات سے مطابقت نہیں رکھتیں، لیکن اس نے خیام کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ یعنی اصل کا فکر و فلسفہ، فضا، لہجہ علائم و رموز کو قائم رکھ کر نئی "چوپائیاں" کہی ہیں جن میں تخلیقی شان اور بھر پور آمد موجود ہے۔ خیام کی اصل رباعیات نہ ہوں مگر خیام ضرور موجود ہے۔ ہر ادبی ترجمے میں اس حد تک نہ سہی، لیکن کسی نہ کسی حد تک الفاظ گریز اور نفیس مضمون کو اپنا کر تخلیقی طور پر ادا کرنا ہی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

ترجمے کی ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ وہ زبان جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اصل زبان کی ہم پلہ ہو اس سے ہیٹی نہ ہو۔ ہمیں انگریزی سے علمی مضامین کے تراجم میں اس لیے دشواری پیش آتی ہے کہ وہ اصطلاحات جو انگریزی میں عام اور رواں ہیں، اردو میں ان کا جواب یا تو موجود نہیں یا اتنا مانوس و معروف نہیں، غرابت کا تاثر پیدا کرتا ہے جس سے سلاست جاتی رہتی ہے۔ تحریر مصنوعی لگتی ہے اس لیے کہ علمی موضوعات پر لکھا ہی کم جاتا ہے۔ اتنے ہی؟ برتے جاتے تو یہ الفاظ و اسالیب بھی بانی ہو جاتے۔

لیکن جہاں تک زندگی کے دوسرے معاملات کا تعلق ہے اردو کا سرمایۂ الفاظ و اسالیب انگریزی کے مقابلے میں ہرگز ہیٹا نہیں بلکہ اس پر بھاری ہے۔ اس نے کئی بڑی بڑی زبانوں کا عطریات ہی نہیں کھینچ لیا، پورے پورے گلشن اور خرمن کے خرمن لوٹ لیے ہیں۔ اردو کی ایسی جامع لغت تیار کی جائے جس میں وہ سب الفاظ جمع ہوں جو اردو مصنفین نے اپنی تحریروں میں برتے ہیں، تو وہ بڑی حد تک عربی، فارسی ہندی اور سنسکرت کی لغتوں سے بے نیاز کر دے گی۔ جدید دور میں اس نے انگریزی سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا ہے، اس کا نظام اصوات ان سب زبانوں کی صوتیات سے بیش ہے، چنانچہ یہ بلاتصرف دوسری زبانوں

کے الفاظ کو اپنا سکتی ہے اور اس کی نحوی ترکیب اس طرح کی ہے کہ ہر لفظ اس میں جوں کا توں کھپ جاتا ہے۔ اسما کو افعال سے ترکیب دے کر بے تکلف نئے مرکب مصادر ڈھال لیے جاتے ہیں۔ آج کل تو یہ روش بہت ہی عام ہے۔ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ اتنی قوموں، طبقوں اور علاقوں میں رائج ہے کہ اس میں اخذ و اکتساب کے دروازے چار طرف سے کھلے ہوئے ہیں۔ بقول علامہ اقبال یہ اپنے دور تشکیل میں ہے اور یہ بھی اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔

روز افزوں بین الاقوامی ارتباط، خیالات کے تبادلے، تعلیمی ترقی، ذرائع ابلاغ کے فروغ، مشترک مسائل اور اسی طرح کے عوامل کی بدولت دنیا کی زبانوں میں بھی برابر کشادگی اور ایک طرح کا اشتراک پیدا ہو رہا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ کوئی "اسپرانٹو" وجود میں آ رہی بلکہ خیالات و تصورات کا اشتراک بڑھ رہا ہے اور الفاظ انھی کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ہر زبان نئے مشترک تصورات کے اظہار کے لیے گنجائشیں پیدا کر رہی ہے۔ دوسری زبانوں کے محاورے اور اسالیب سے بھی استفادہ کر رہی ہے۔ یہ عمل تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس میں علمی و ادبی دونوں طرح کے تراجم مددگار ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اس ذہنی اشتراک کی بنا پر ترجمے کی دشواریاں کم اور سہولتیں زیادہ ہوتی جائیں گی۔ مخصوص علمی موضوعات کی نسبت ادب کا حلقہ اشاعت زیادہ وسیع ہوتا ہے لہٰذا ادبی تراجم کی اہمیت اپنی جگہ محکم اور مسلم ہے۔ ہر اچھی کتاب کا ترجمہ ذہنی کشادگی کے علاوہ خود زبان میں بھی کشادگی اور اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ آج کل ہر پڑھے لکھے آدمی کے لیے ایک سے زیادہ زبانوں کی تعلیم نہ صرف مفید بلکہ لازمی خیال کی جاتی ہے۔ ادبی تراجم بھی عین اسی طرح کی افادیت کے حامل ہیں۔

شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات

پروفیسر جیلانی کامران

(۱)

شان الحق حقی نے اپنے مقالے میں ترجمے کے لسانی عمل کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانوں کے وسیع گروہوں کے مابین ربط اور اشتراک کے لیے ترجمہ ایک بنیادی تقاضا بھی ہے اور اس کے کئی افادی پہلو بھی ہیں۔ انھوں نے مذہبی کتابوں، فنی اور سائنسی تعلیمات کے تراجم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مقالے کا زیادہ تر حصہ اور شعری ادب کے تراجم کے بارے میں دشواریوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ شعری ادب کے ترجمے کے سلسلے میں انھوں نے مترجم اور متن کے رشتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ترجمہ اس مقصد کے تابع ہوتا ہے جس کی خاطر کسی شعری یا ادبی متن کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اور مقصد بھی یا تو علمی ہوتا ہے یا اسے ادبی ضرورتیں بروئے کار لاتی ہیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے شعری ادب کے ترجمے کی ذیل میں یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کیا شعری ادب کا ترجمہ نثر میں کارآمد ہوتا ہے یا اسے شعر ہی میں منتقل کرنا مناسب ہے جو اس سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ نثری ترجمہ اصل شعری متن کے مزاج کے ساتھ غالباً انصاف نہیں کرتا اور اس طرح نثری ترجمے کے باعث اصل شعری متن کی تاثیر کم ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی سوالوں کے ساتھ یہ سوال بھی سامنے آیا ہے کہ کیا شعری متن کا براہ راست ترجمہ ممکن بھی ہے؟ جبکہ زبانوں کے محاورے اور زبانوں کا لسانی سانچہ مختلف ہوتے ہیں اور اگر ایسی دشواری رفع نہیں کی جا سکتی تو کیا ترجمہ کرنے والے کو اجازت ہے کہ وہ

وجدانی تحریک کے زیر اثر اصل متن کی روح میں اترے اور آزاد فکر کی مدد سے اصل شعری متن کو ترجمہ کرے۔ یوں ترجمہ تشریحی ہوگا۔ ترجمے کے عمل کی وضاحت کے سلسلے میں انھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کا ذکر کیا ہے جو فارسی اور عربی سے ترجمہ کیا گیا تھا شکسپیر اور فٹز جیرالڈ کا تذکرہ کیا ہے نذرالاسلام اور ٹیگور کی بنگالی نظموں کا حوالہ دیا ہے لارڈلٹن کی نظم اور احسن لکھنوی اور چار دوسرے شاعروں کے ترجمے کا ذکر کیا ہے جو ''اندھی پھول بیچنے والی کے گیت'' سے مشہور ہے۔ شان الحق حقی کا کہنا ہے کہ ترجمے کے لیے خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے تاہم ضروری یہ ہے کہ ترجمے اور اصل متن کا باہمی رشتہ برابر قائم رہے اور اصل متن کے ساتھ تعلق ان نئے لوگوں کے لیے برابر سودمند ہو جن کے لیے اصل شعری متن کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

(۲)

ترجمے کے عمل کا اگر ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف ممکن ہے کہ کوئی بھی ترجمہ سو فیصد اصل متن کے مطابق نہیں ہوتا اور دوسری بات یہ نظر آتی ہے کہ خواہ گفتگو ہی کے جملوں کو دو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تو جہاں زبانیں ایک ہی لسانی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں وہاں جملے کی ساخت تقریباً یکساں ہوگی لیکن جہاں ایسے یکساں لسانی گھرانے موجود نہیں، وہاں جملے کی ساخت میں بھی رد و بدل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو ترجمے کے عمل کی بنیادی دشواری قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم ایسی دشواری ایک اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ترجمے کی صورت میں متن کی شکل ہر طور بدلتی ہے۔ متن ترجمے کے عمل سے گذرتے ہوئے ایک نیا قالب اختیار کرتا ہے اور نئے لسانی پیکر میں نئے لفظوں کے ذریعے آشکار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر زبان کے الفاظ کی اپنی محاکاتی فضا ہوتی ہے۔ یوں ترجمے کا عمل متن کو ایک نئی لسانی آب و ہوا میں آباد کرتا ہے۔ اس امر کو دوسرے اصول کے طور قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اگر دو اصولوں کی روشنی میں ترجمے کے عمل کو دیکھا جائے تو علم ہوگا کہ ترجمے کے ذریعے الفاظ بدلتے ہیں۔ لیکن متن کا مافیہ قائم رہتا ہے اور ترجمے کے عمل

کا انسانی مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ متن کا مافیہ لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہے اور لوگ اس مافیہ کے ذریعے وحدت انسانی کے تصور کی تائید کرتے رہیں کہ زمین ایک ہے اور اس پر ایک ہی نوع انسان آباد ہے۔

شان الحق حقی نے ادب عالیہ اور شعری ادب کے ضمن میں بائبل کے مشہور ۱۶۱۱ء کے ترجمے کا ذکر کیا ہے اور ایسے ہی حوالے کے تحت شاہ عبدالقادر کے مشہور ترجمے کی طرف اشارا بھی کیا ہے جو عربی نحو کے مطابق آیات کو اردو میں منتقل کرتا ہے۔ ان عظیم ترجموں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے غالباً اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا کہ لاطینی بائبل اور قرآن کریم دونوں کی قدیم ترین روایت ناظرہ تلاوت کی رہی ہے اور بلند آواز سے دونوں زبانوں میں مقدس کتابوں کی تلاوت ہوتی رہی ہے اور عصر حاضر میں بھی برابر ہوتی ہے۔ دونوں تراجم میں اس اعتبار سے جملوں کے صوتی تاثر کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے اور یوں وہ گہرا اثر صادر ہوتا ہے جو انسان کے لیے لازمی ہے ..... تاہم جہاں تک بائبل کا تعلق ہے ۱۶۱۱ء کے ترجمے کے لیے جو کمیشن قائم کیا گیا تھا اس نے بائبل کے عبرانی مزاج کو ملحوظ رکھا تھا اور اہل علم کی متفقہ رائے ہے کہ ۱۶۱۱ء کے ترجمے نے اپنے عہد کی انگریزی کو ایک نئے اسلوب سے روشناس کیا تھا۔ اسی طرح شاہ عبدالقادر کے ترجمے نے بھی اردو زبان کو ایک اعلیٰ پیرایۂ اظہار دیا ہے اور اس ترجمے کو اردو نثر میں یقیناً اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

میں نے ان عظیم تراجم کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان تراجم میں 'لفظ' کو کسی طرح ثانوی حیثیت نہیں دی جاسکتی مقدس کتابوں میں لفظ ہی قطعی اور مستقل اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے اصل متن کی ترکیب کے مطابق لفظ کے مطابق لفظ کا استعمال لازمی ہے اور اسے کسی معاشرے میں رائج جملوں کی ساخت کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ کسی زبان کی گرامر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان آسمانی کتابوں کے جملوں کو اپنے قواعد کے مطابق بدل دے جن کے الفاظ کا مقام نشست اور وجود کے اعتبار سے قطعی ہے۔ اس لیے ترجمے کا عمل ان مقدس کتابوں کے ضمن میں لفظ کے مطابق لفظ اور مقام لفظ کے مطابق مقام لفظ کے احوال سے انحراف

نہیں کر سکتا لیکن ادب عالیہ کی شعری تخلیقات کے بارے میں اس اصول کو استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔

(۳)

شعری ادب کے ترجمے کے بارے میں اس خیال کو ملحوظ رکھنا کہ شعری متن کو مروجہ شعری صورت ہی فراہم کی جائے اس لیے ضروری ہے کہ مختلف لسانی گھرانوں کے عروضی نظام عموماً مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ غالب کی غزل کو انگریزی کی (Heroic Couplet) میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے تو یہ سوچنا مناسب ہے کہ محض سانچے کی مشابہت سے غالب کی غزل کا انگریزی ترجمہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ غالب کی صد سالہ تقریبات پر کلکتے اور نیو یارک سے غالب کے ترجمے اسی اصول کے تحت کیے گئے تھے اور شائع بھی ہوئے تھے اور دونوں تراجم میں غالب کے ساتھ قطعاً انصاف نہیں ہوا تھا۔ انگریزی شعر کی روایت نے غالب کے مقام کو گرا دیا تھا۔ غالب کو بجا طور پر صوفی نیاز کے انگریزی ترجمے میں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ صوفی نیاز کا ترجمہ روایتی (Heroic Couplet) کا سانچہ استعمال نہیں کرتا لیکن غالب کی شعریت تک ضرور رسائی پاتا ہے۔ اسی طرح جاوید نامہ اور آربری کا ترجمہ بھی غورطلب ہیں نکلسن نے اسرار خودی کے انگریزی ترجمے میں اسلوب کی بجائے اسرار خودی کے مافیہ کو مدنظر رکھا ہے۔ اسی طرح یورپی زبانوں میں دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کے وہی انگریزی ترجمے مقبول ہوئے ہیں جہاں نثری طریق اختیار کیا گیا اور گوئٹے کے فاوسٹ کو بھی ایسے ہی طریقے سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ جرمن زبان ٹیوٹانک لسانی گھرانے کی زبان ہے اور انگریزی کا تعلق بھی اسی لسانی گھرانے کے ساتھ ہے اور جہاں تک اطالین زبان کا تعلق ہے وہ بھی انگریزی کے عروضی نظام سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

کسی زمانے میں "میراجی" نے یورپی قرن وسطیٰ کے ''وانڈرنگ سکالرز'' کے گیتوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور یہ ترجمے ''میراجی'' کی کتاب ''مشرق و مغرب کے نغمے'' میں شامل ہوئے اور شائع ہوئے تھے، لیکن ''میراجی'' نے اضافتوں اور غزل شعری زبان کے استعمال سے

اُن گیتوں کی سادگی کو زائل کر دیا جو اصل شعری متن میں برابر موجود ہے اور انگریزی میں بھی جن کا حسن اور جن کی تازگی محسوس کی جاتی ہے۔ میراجی نے شعر کو شعر میں ترجمہ کرنے کا اصول اپنایا تھا اور نتیجہ حسب حال برآمد نہ ہوسکا۔ تاہم بعض حالات میں نظم کا ترجمہ نظم میں بھی ممکن ہوا ہے۔ مثلاً مجید ملک کی نظم ''مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں''۔ تاثیر کا سانیٹ تو نے اُلفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے یا احسن لکھنوی کی مشہور نظم ''گود میں مالن کے ہیں ٹوٹی ہوئی ڈالی کے پھول''۔ ایسے تراجم ہیں جن کو کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عظمت اللہ خاں نے ورڈز ورتھ کی دو نظموں کا ترجمہ ''کوئل'' اور 'ہم سات ہیں' کیا ہے جن کو خوب صورت نظمیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم اگر ان تراجم کو جانچا جائے تو اصل متن کا ردھم' اور کیڈنس ان تراجم میں منتقل نہیں ہوئے اور قدامت پسند ادیبوں کا خیال ہے کہ نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہوتی ہے۔ ان دونوں صورتوں سے جو بات نمایاں ہوتی ہے یہ ہے کہ اگر انگریزی نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہے تو اس شعریت کے ضروری اجزا ردھم اور کیڈنس بھی ہیں۔ لیکن اردو ترجمے میں نہ تو وہ کیڈنس ہے اور نہ ردھم ہے۔ تو اس سے یہی مراد لی جا سکتی ہے کہ اُردو شاعروں نے ترجمے کے لیے اپنی پسند کے عروض استعمال کیے ہیں اور یوں شعر کو شعر میں ترجمہ کرتے ہوئے آزادی' انتخاب کا استعمال کیا ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر شعر کو شعر میں ترجمہ کرتے وقت نظم کا پیکر بدل سکتا ہے، عروض برقرار نہیں رہتے، ردھم وہی نہیں رہتا اور زبان اور شعری جملے کا کیڈنس بھی قائم نہیں رہتا تو پھر شعر کو شعر میں ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیا شعر کو شعر میں اس لیے ترجمہ کرنا لازمی ہے کہ معاشرے کی ادبی عادات ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور کیا معاشرے کی ادبی عادت کو بدلا نہیں جا سکتا تاکہ شعری ادب کے مافیہ سے براہ راست ہم کلامی ممکن ہو۔

(۴)

انگریزی شاعری کے دو مشہور شاعروں ''بائرن اور ''کیٹس'' کی

1. Rhythm/Cadence.

تعلیقات بھی اس ضمن میں قابل توجہ ہیں۔ اس امر سے انگلستان کے علمی حلقے بھی خاصے پریشان ہوئے تھے کہ مغربی یورپ کی زبانوں میں بائرن کے تراجم تو موجود تھے لیکن کیٹس کے تراجم دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس اعتبار سے انگلستان کی رومانی تحریک کی پہچان بائرن بن چکا تھا۔ آخرکار غور و فکر کے بعد معلوم ہوا کہ بائرن ایک ایسا شاعر ہے جسے ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ کیٹس کی شاعری ترجمے کی گرفت میں نہیں آتی۔ دونوں شاعروں کی شعری زبان میں نمایاں فرق یہ ہے کہ بائرن کی زبان بیانیہ اور شفاف ہے۔ جب کہ کیٹس کی شعری زبان استعارے کا استعمال کرتی ہے اور اس کی امیجری زبان کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ اگر اس بات کو ملحوظ رکھا جائے تو استعارے کی شعری زبان کو ترجمہ کرنا نہایت غیر مناسب ہے جب تک کہ استعارے کو منہا کرنے کا اصول تسلیم نہ کیا جائے۔ کیوں کہ استعارہ شعری زبان کے لسانی پیکر میں ضم ہوتا ہے اور اسے ترجمہ کرتے ہوئے زبان کی محض ایک جہت ہی کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے جو حقیقتاً شاعری کے مافیہ سے بے تعلق ہوتی ہے۔ اس لیے غالب کو ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے اور غالباً جو ترجمے سو سالہ تقریب پر شائع ہوئے تھے اسی لیے ناکام ثابت ہوئے تھے۔

''بائیو گرافیا لٹریریا''[1] میں کولرج نے منظومات اور شاعری کو ایک دوسرے سے الگ قرار دیا ہے۔ اُس کی رائے ہے کہ اوزان اور عروض کے استعمال سے کسی شے کو شاعری نہیں بنایا جا سکتا۔ تاہم اُن کو نظم کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ نظم بھی شاعری ہو۔ کولرج کا کہنا ہے کہ شاعری کے لیے عروض اور قافیے کی کوئی قید نہیں۔ شاعری ان میکانکی پابندیوں کے بغیر بھی رونما ہوتی ہے اور ہوتی رہی ہے۔ کولرج نے اس ضمن میں پرانے عہد نامے کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ جو عظیم ترین شاعری ہیں (مثلاً ''یرمیاہ'' نبی صحیفہ) اور اُن پر نہ تو قافیے کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ وہ نظام عروض کی پابند ہیں۔ کولرج کی رائے میں لازوال شاعری وہی ہے جو ترجمے کے عمل سے گزر کر شاعری رہے اور ترجمے کے عمل کے بعد اصل شعری متن کا مافیہ

1. Biographia Literaria.

ہی شاعری کی نشاندہی کرتا ہے ۔ اس اعتبار سے کسی شعری متن کا مافیہ اصل شاعری ہے !

شان الحق حقی نے اپنے مقالے میں شکسپیئر کے بعض ڈراموں کے ترجمے کا ذکر کیا ہے اور مولوی عنایت اللہ دہلوی کے تراجم کی طرف اشارا کیا ہے ۔ تاہم شکسپیئر کے کچھ ڈراموں کو آغا حشر نے بھی اردو میں منتقل کیا تھا ۔ لیکن اس ضمن میں قابل توجہ یہ ہے کہ شکسپیئر کو منظوماتی طور پر ترجمہ کرنے میں بہت کم کامیابی کا امکان رہا ہے ۔ شعر کو شعر میں ترجمہ کرنے سے شکسپیئر شاید باقی نہیں رہتا ۔ تاہم کمال امروہی نے نرگس آرٹ کنسرن کی فلم ''رومیو اینڈ جولیٹ'' میں شکسپیئر کی شاعری کو اردو میں منتقل کرکے جو کامیابی حاصل کی تھی وہی اس امر کا ثبوت ہے کہ شعر کو شعر میں ترجمہ کرنے کا طریق متروک ہو چکا ہے ۔ شاعری کو شاعری میں منتقل ہونا چاہیے !

تاہم شعر کو شعر اور نظم میں ترجمہ کرنے کی روایت ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب اردو شاعری میں نہ تو جدید نظم ظاہر ہوئی تھی اور نہ نثری نظم ہی کے تجربے ہی سامنے آئے تھے ۔ اس لیے بے قافیہ نظم اور نثری نظم کی مدد سے کسی بھی شعری متن کو اردو میں بڑی آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اصل متن کی شاعری سے براہ راست ہم کلام ہونا ممکن ہو سکتا ہے ۔ شان الحق حقی نے اپنے مقالے میں نثری ترجمے کا ذکر بھی کیا ہے لیکن میرے خیال میں نثری ترجمے کی ترکیب ایسے طریق کار کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی ۔ کیوں کہ انھوں نے نثری ترجمے کو منظوم ترجمے کی ضد کے طور پر استعمال کیا ہے ۔

میرے خیال میں اگر شعری ادب کے تراجم کے لیے اُن پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے جو عروض ، قافیے اور اضافتوں کی سکہ بند زبان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن ان پابندیوں کو نرم کرتے وقت شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی شرط کا عاید کرنا لازمی ہے ۔ اگر تراجم کی زبان شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی صلاحیت کو

بروئے کار لاسکتی ہے تو تراجم کی زبان کا ایک نیا شعری آہنگ ظاہر ہوگا ۔ کیوں کہ شاعری جب بھی کوئی قالب اختیار کرتی ہے شاعری ہی کو رونما کرتی ہے ۔ ایسا رویہ اور ایسا طریق کار اعلیٰ شعری ادب کو عالمی ورثے میں شامل کرتے ہوئے میکانکی ہئیت کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے قابل ہوگا اور دنیا کے اُس شعری ورثے سے جو ہمارے پاس ہے اور ہماری عظیم روایتوں میں سے ہے ، دوسری قومیں مستفید ہو سکیں گی اور ہم بھی عالمی ورثے کو اپنے شعری ادب میں شامل کرسکیں گے ۔ شاعری کبھی اپنے الفاظ میں روش نہیں رہتی ۔ اس لیے جس بشکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے اپنے ہی اصل لباس کو آشکار کرتی ہے ۔ انسان کے قلب و نظر کی گفتگو شاعری ہے اور اسے قلب و نظر کی گفتگو ہی میں منتقل کیا جا سکتا ہے ۔ ترجمے کے عمل کو قلب و نظر کی گفتگو بنا دینے سے اعلیٰ شعری ادب کے در و بام کھل سکتے ہیں ! شان الحق حقی نے اسے وجدانی تحریک کا نام دیا ہے ۔

صحافت میں ترجمہ کے مسائل اور مشکلات

ڈاکٹر مسکین حجازی

ہمارے بہت سے ادیبوں نے ہمارے عظیم صحافیوں کا ذکر کرتے ہوئے صحافت کو ''پر خار وادی '' سے تشبیہ دی ہے - جن صحافیوں نے تاریخ میں بلند مقام حاصل کیا ہے وہ بھی اپنے اپنے انداز میں صحافت کو ''مسائل اور مشکلات'' سے تعبیر کرتے ہیں اسے دشوار گزار اور سنگلاخ والی قرار دیتے ہیں چنانچہ نظری طور پر صحافت اور '' مسائل و مشکلات'' لازم و ملزوم ہیں لیکن صحافت اور ترجمہ کے مسائل و مشکلات لازم و ملزوم نہیں ہیں ۔ صحافت میں ترجمہ کے مسائل ہمیں دور غلامی سے ورثہ میں ملے ہیں ہم بڑی سعادت مندی اور تندہی سے اس '' ورثہ '' کی حفاظت کر رہے ہیں ۔

دنیا کے بیشتر ملکوں میں یہ مسئلہ موجود نہیں ہے - خبر رساں اداروں اور خبروں اور اطلاعات کے دوسرے ذرائع سے معلومات قومی زبان میں ابلاغ عامہ کے اداروں میں پہنچتی ہیں اور'' سب ایڈیٹر '' یا مضمون نگار اپنی صلاحیت ان کو لفظی معنوی طور پر بہتر اور جامع بنانے پر صرف کرتے ہیں انھیں ترجمہ کا مسئلہ پیش نہیں آتا -

ہمارے ہاں نوے فیصد اخبارات و جرائد قومی زبان میں شائع ہوتے ہیں ۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن سے خبروں کے زیادہ بلیٹن اور دوسرے پروگرام قومی زبان میں یا مقامی زبانوں میں پیش کیے جاتے ہیں لیکن خبر رساں ادارے خبریں انگریزی میں بھیجتے ہیں سرکاری ، نیم سرکاری یا نجی ادارے بھی بیشتر صورتوں میں اپنے پریس ریلیز اور دوسری اطلاعات انگریزی میں ارسال کرتے ہیں اور ابلاغ عامہ کے اداروں میں ان کا اردو میں یا مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے ۔

اس سلسلے میں مفتی خوشی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انگریزی اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے انگریزی میں نشر ہونے والے پروگراموں سے وابستہ افراد کو اب اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ملک میں بیشتر صورتوں میں اظہار خیال اپنی زبانوں میں ہوتا ہے لیکن اس قسم کا اہتمام ساری دنیا میں ہے - ہر ملک کے ریڈیو سٹیشنوں سے غیر ملکی زبانوں میں پروگرام پیش ہوتے ہیں - اس مقصد کے لیے متعلقہ زبانوں کے چند ماہرین کی خدمت حاصل کر لی جاتی ہے ۔ ان کو اگر کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ جزوی اور انفرادی مشکل ہوتی ہے ہمارے ہاں تو یہ صورت بھی موجود ہے کہ اپنی زبان میں کہی یا لکھی گئی باتیں پہلے انگریزی میں ترجمہ ہوتی ہیں اور خبررساں اداروں کے ذریعے ابلاغ عامہ کے اداروں میں پہنچتی ہیں - وہاں ان کا اپنی زبان میں ترجمہ ہوتا ہے ۔ اس عمل میں بعض اوقات معنی یا مفہوم پر ناگفتنی بھی بیت جاتی ہے -

مرکزی نظام کا فقدان :

اردو صحافت میں ترجمہ کا اصل اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں اصطلاح سازی اور ان کی معیار بندی کا نظام موجود نہیں ہے اس گزارش کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مقتدرہ قومی زبان—اردو سائنس بورڈ (سابق مرکزی اردو سائنس بورڈ) مجالس زبان دفتری یا اردو اکیڈمیوں ایسے ادارے موجود نہیں ہیں - الحمد اللہ یہ ادارے قائم دائم ہیں اور مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات پر مشتمل بھاری بھرکم کتب بھی شائع کر چکے ہیں ۔ لیکن جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ان میں سے بیشتر اصطلاحات ابھی تک بوجوہ رائج نہیں ہوسکیں ۔ ویسے بھی ابلاغ عامہ کے اداروں میں ان سے استفادہ کرنے کی گنجائش کم ہے - مختلف کتابوں میں اصطلاحات کی تلاش کے لیے وقت درکار ہوتا ہے جو ان اداروں میں مفقود ہے علاوہ ازیں ایجادات و انکشافات کی تیز رفتاری کے اس دور میں روز نئے نام اور اصطلاحیں وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ مرکزی نظام سے میری مراد ایسا نظام ہے جس کے تحت تمام نئے ناموں اور اصطلاحات کے موزوں تراجم تیار ہو کر ابلاغ عامہ کے اداروں میں پہنچ جائیں اور تمام اخبارات میں انہی تراجم استعمال ہوں - اس وقت صورت یہ ہے ایک اخبار میں

(Space Module) کا ترجمہ خلائی گاڑی چھپتا ہے - دوسرے میں قمری گاڑی - تیسرے میں چاند گاڑی اور چوتھے میں "مہتاب چلنے والی گاڑی" شائع ہوتا ہے - ایک جگہ "لیبر روم" اردو میں لکھا نظر آتا ہے تو دوسری جگہ اس کا ترجمہ مزدوروں کا کمرہ چھپتا ہے - نومبر ۱۹۸۵ء کے پہلے ہفتہ کے دوران بعض اردو اخبارات ہیں انگریزی ناموں اور اصطلاحات کے جو مختلف تراجم شائع ہوئے ان میں سے چند ضمیمہ الف میں درج کر دیے گئے ہیں - ایک تعلیم یافتہ قاری ان تمام تراجم کو سمجھ سکتا ہے لیکن مختلف اخبارات میں تراجم یا مختلف اصطلاحات کا شائع ہونا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے اردو اخبارات میں ترجمہ پر مامور اصحاب کسی رہنمائی کے لیے کوئی نظام یا ادارہ موجود نہیں ہے - وہ الفاظ کے معانی اردو انگریزی لغت میں دیکھتے ہیں لغت میں ہر لفظ کے کئی معانی درج ہوتے ہیں لہٰذا مترجمین اپنی صوابدید سے ترجمہ کر لیتے ہیں مثلاً لغت میں انگریزی کے لفظ (Pauctiy) کے معانی قلت - کمی - کمیابی - فقدان - قحط - قحط الرا جال - درج ہیں - ایک بار ایسا بھی ہوا کسی ایک اخبار میں (Pauctiy of Sugar) کا ترجمہ چینی کا قحط الرجال شائع ہو گیا - ایک بار خبر یہ تھی کہ ایک عورت کو ایک مندر کے اندر گولی مار دی گئی اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ عورت کو کنپٹی میں گولی مار دی گئی - کیونکہ انگریزی میں (Temple) کنپٹی کو بھی کہتے ہیں - میرے نزدیک یہ صورت حال مترجمین کی نااہلی کی دلیل نہیں - ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے جن معروضی حالات میں کام ہوتا ہے ان میں ایسا اکثر ہونا چاہیے -

اسم معرفہ کی پہچان :

اس مسئلہ کے کئی پہلو اور بھی ہیں ٹیلی پرنٹروں اور تار (ٹیلیگرام) سے جو عبارت ذرائع ابلاغ کے دفتر میں پہنچتی ہے وہ انگریزی کے بڑے حروف (Capital Letters) میں ہوتی ہے - عام انگریزی متن میں صرف جملوں کے پہلے حروف یا اسم ہائے معرفہ بڑے حروف (Capital Letters) سے شروع ہوتے ہیں - اسلئے ان کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے مگر کریڈ (Creed) اور تار کے ترجمہ میں بعض اوقات دقت پیش آتی ہے - کاپر فیلڈ

(Copperfield) جو اصل میں کسی کا نام ہوتا ہے اس کا ترجمہ تانبے کا کھیت بن جاتا ہے -

معمر القذافی کو ہمارے ہاں کئی بار قذاقی بلکہ غذافی بھی لکھا جاتا رہا - الجزائری رہنما بومدین کا نام کئی بار بومدین اور بومحی الدین بھی چھپا - انگریزی کی بدولت بعض مقامی نام ہی بعض اوقات عجیب و غریب صورتیں اختیار کر لیتے ہیں مثلاً ایک ہی کو مختلف اخباروں میں کانجر کنجر کوٹ - کوٹ - خنجرٹ وغیرہ لکھا گیا - انگریزی میں بعض اوقات ہجوں کی غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں - اگر ایسی کسی غلطی کے باعث ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹر واحد قریشی بن جائیں تو خیر مگر عطش درانی، آتش درانی بن جائیں تو کچھ کا کچھ ان جاتاہے اور اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے -

یہاں ضمناً یہ گزارش بھی بے جا نہ ہو گی کہ کسی زبان کا رسم الخط بدلنے سے بعض الفاظ اور معانی اسی طرح بدل جاتے ہیں جس طرح غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے -

تاریخ اور جغرافیہ :

انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونے کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ سے مکمل آگاہی بھی ضروری ہے - یہ مسئلہ اس لیے ہے کہ یہ آگاہی آسان بات نہیں ہے - اگر اس آگاہی سے محروم ہوں تو انگریزی میں (Daultana) ڈولٹانہ لکھ کر دولتانہ پڑھتے ہوئے وٹو کو وتو پڑھ جائیں گے - یا معروف نام مردان کو مرڈان (Mardan) اور ہوٹی (Hoti) کو ہوتی لکھ دیں گے -

عربی اور فارسی کے نام بذریعہ انگریزی :

خبر رسانی کا نظام ایسا ہے کہ عربی اور فارسی یا دوسری زبانوں کے نام بھی ہمارے ہاں بذریعہ انگریزی آتے ہیں اور کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں - اگر مترجم کا تاریخ اور جغرافیہ کا علم وسیع نہ ہو تو وہ کئی ملکوں کے صحیح نام بھی اردو میں منتقل نہیں کر سکے گا - مصر انگریزی میں جا کر ایجپٹ (Egypt) بنتا ہے اور پھر اردو میں (Egypt) سے دوبارہ مصر بنتا ہے اردن جیسا سیدھا نام انگریزی میں جارڈن (Jordan) اور

دریائے سندھ (Indus River) بن جاتا ہے ۔ عربی زبان کے حروف تہجی میں حرف ''گاف'' موجود ہی نہیں ہے لیکن جیم سے شروع ہونے والے کئی عربی یا فارسی نامے انگریزی کے حرف جی ''G'' کی بدولت ''گ'' میں بدل جاتے ہیں جولان کی پہاڑیوں کو ہمارے ہاں عرصے تک گولان کی پہاڑیاں بھی لکھا جاتا رہا ۔ عربی فارسی اور اردو کے حرف ''ض'' کو عموماً ''انگریزی کے حرف ''ڈی'' ''D'' میں ادا کیا جاتا ہے مثلاً ''رضوان کو الگ عربی میں عموماً'' ردوان (Ridwan) لکھیں گے ۔ اس صورت حال سے مکمل آگہی نہ ہونے سے مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی ۔ فرانسیسی ، ہسپانوی ، جرمن اور روسی نام بھی بذریعہ انگریزی اردو میں منتقل ہوئے ہیں لیکن اصل زبانوں میں ان کا تلفظ مختلف ہوتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اردو میں کئی ناموں کی املا غلط ہو جاتی ہے ۔ آنجہانی خروشیف کا نام بارہا کروشیف ، کرسچوف اور کرسچیف کے طور پر بھی لکھا گیا ۔ سیدھا سادا نام علیمہ اگر روسی سے براستہ انگریزی آئے تو اسے غلیمہ پڑھا اور لکھا جائے گا ۔

واقفیت عامہ :

ان معروضات سے واضح ہو جاتا ہے کہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے صرف زبان دان ہونا ناکافی نہیں ہے مترجم کو تاریخ دان اور جغرافیہ دان بھی ہونا چاہیے مختلف علوم و فنون بلکہ مختلف پیشوں ، مشاغل اور کھیلوں کی معروف اصطلاحات کا بھی پتہ ہونا چاہیے ۔ دونوں زبانوں پر قدرت تو خیر ناگزیر ضرورت ہے ۔ دونوں زبانوں میں جملے بنانے کے طریقوں ، زبانوں کے مزاج ، محاورات ، ضرب الامثال ، تلمیحات و استعارات سے واقفیت کے بغیر اردو میں صحیح ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے اخبارات میں ترجمہ سب ایڈیٹر کرتے ہیں ۔ سب ایڈیٹر تو کیا کوئی بھی شخص ہمہ دان نہیں ہو سکتا البتہ محنت اور لگن سے واقفیت عامہ اور زبانوں پر زیادہ دسترس ممکن ہو سکتی ہے ۔ ہمارا صحافتی نظام کچھ ایسا ہے کہ ترجمہ کا یہ مشکل ترین کام بالعموم نو آموز صحافیوں کو سونپا جاتا ہے ان کی رہنمائی اور مدد کے لیے تجربہ کار صحافی بھی موجود ہوتے ہیں تاہم نو آموز صحافیوں کی قابلیت کا امتحان ''ترجمہ'' ہی تصور ہوتا ہے ۔ یہ کام انتہائی ذمہ داری کا ہے اور اس سے وہی لوگ

بطریق احسن عہدہ برآہو سکتے ہیں جن کے علم ، بالخصوص واقفیت عامہ زبان دانی اور تجربہ کا دائرہ زیادہ وسیع ہو محض زبان دانی ترجمہ کے لیے کافی نہیں ۔ کیونکہ خبروں اور دوسرے صحافتی مواد کا ترجمہ ہی نہیں کیا جاتا بیشتر صورتوں میں ان میں حالات کے سیاق و سباق میں مکمل اضافہ ہی کرنا پڑتا ہے ۔ اکثر خلاصہ نویسی کی ضرورت پیش آتی ہے دوبارہ لکھنے والے کا پہلے لکھنے سے زیادہ عالم و فاضل ، تجربہ کار اور ماہر ہونا ضروری ہے ۔ ہمارے ہاں جیسا تیسا ترجمہ کر لینے ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اردو میں کسی نہ کسی طور مفہوم ادا ہو جائے۔

لسانی مسئلہ :

کسی نہ کسی طور پر مفہوم ادا کرنے کی روش یہ اپنی زبان پر عبور نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر بہت سے ایسے انگریزی الفاظ اردو املا میں لکھ دیئے جاتے ہیں جن کے ٹھیک ٹھاک اور خوبصورت اردو متبادل موجود ہیں مجھے اکتوبر کے آخری دو ہفتوں کے دوران چند اردو اخبارات اردو میں املا میں لکھے ہوئے جو انگریزی الفاظ ملے ہیں ان کی فہرست ضمیمہ ب میں دی گئی ہے۔

صحت زبان کے نہیں ابلاغ کے زاویہ نگاہ سے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایک انگریزی لفظ زبان زد عام ہو چکا ہے تو اسے اردو میں من و عن لے لینا چاہیے مثلاً سکول ۔ کالج ۔ ورکر ۔ انسپکٹر ۔چیکر۔ فائل وغیرہ ۔ لیکن اردو میں انگریزی زبان کے قاعدے کے مطابق واحد کو جمع بنا کر اردو میں لکھنا اپنی زبان کے ساتھ زیادتی ہے ۔ سکولز۔ کالجز۔ ورکرز۔ انسپکٹرز۔ چیکرز۔ فائلز ایسے الفاظ اردو اخبارات میں عام استعمال ہو رہے ہیں ۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں بعض لوگ ملی جلی زبان بولتے ہیں یعنی اردو انگریزی کو ملاتے رہتے ہیں لیکن تحریر میں صحت زبان کا خیال نہ رکھنا زبان کے ساتھ زیادتی بلکہ اس کا مضحکہ اڑانے کے مترادف ہے ۔ ایسے بعض مضحکہ خیز الفاظ ضمیمہ ج میں درج کیے گئے ہیں ۔

تنگی وقت کا مسئلہ :

اخبارات میں کام ایک ضابطہ' اوقات کے مطابق ہوتا ہے خبریں ایک

مقررہ وقت میں لکھی یا ترجمہ کی جاتی ہیں اس وقت میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ سب ایڈیٹر پر خاص کیفیت (موڈ) طاری ہو یا کوئی خارجی تحریک ہو تو کام کرے - یا وہ ترجمہ پر نظر ثانی کرے یا کسی لفظ کے بر محل معانی تلاش کرنے کے لیے مختلف لغت دیکھے - صحیح ترجمہ کرنے کے لیے مستعدی چوکسی ، زباندانی ، خلاصہ نویسی ، واقفیت عامہ اور تیز کام کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ سب صلاحیتیں موجود ہوں گی وہ زیادہ معاوضہ اور بہتر شرائط کار چاہے گا - اسے دوسری جگہوں پر بہتر مواقع مل سکتے ہیں اگر وہ خوشدلی سے کام نہیں کرے گا تو کام معیاری نہیں ہوگا اگر اس میں یہ صلاحیتیں نہیں ہیں تو پھر بھی اس کے کام کا معیار متاثر ہوگا -

وسائل کی کمی :

عام قاری چند معروف اخبارات و جرائد کے نام جانتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں اخبارات و جرائد کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ ہے یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ بیشتر اداروں میں خبروں کے شعبوں میں حوالہ کی ضروری کتب بھی نہیں ہوتیں - بعض صورتوں میں سب ایڈیٹر کی رسائی لغت تک بھی نہیں ہوتی -

درجہ دوم و سوم کے اخبارات ہی نہیں - بیشتر علاقائی اخبارات و جرائد مالی وسائل کی کمی کے باعث اسی صورت حال سے دوچار ہیں - یہ کمی صحافت کے معیار پر اثر انداز ہوتی ہے -

تربیتی سہولتوں کا فقدان :

ترقی یافتہ ملکوں میں مختلف پیشوں سے وابستہ افراد کے لیے دوران ملازمت تربیت اور کارکردگی بہتر بنانے کے لیے کورسوں کا اہتمام موجود ہوتا ہے - وقفوں کے بعد سیمینار یا ورکشاپ منعقد کیے جاتے ہیں - ان میں متعلقہ پیشوں سے وابستہ افراد کی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے اور اسے بہتر بنانے کے گر سمجھائے جاتے ہیں اب ہمارے ہاں بھی اس قسم کے سیمینار اور ورکشاپ ہونے لگے ہیں لیکن ابھی تک صحافت میں ترجمہ بلکہ صحافت کے کئی دیگر پہلوؤں کے بارے میں کسی ورکشاپ کا اہتمام نہیں کیا گیا - یہ اہتمام خود صحافیوں کی تنظیموں یا اردو اخبارات

کے سب ایڈیٹروں کی انجمنوں کو کرنا چاہیے - ایسا اہتمام ہو جانے سے ترجمہ کا معیار اور نتیجتاً صحافت کا معیار بہتر بنانے میں مدد ملے گی -

ضمیمہ الف

Anti State وطن دشمن - ملک دشمن - مملکت دشمن - خلاف ملک - خلاف وطن -

Freedom fighter مجاہد - مجاہد آزادی - حریت پسند - آزادی پسند - حریت کیش -

Fundamentalist راسخ العقیدہ - اصل پسند - بنیاد پرست -

White minority سفید اقلیت - سفید فام اقلیت - نسل پرست اقلیت - گوری اقلیت -

Racialism نسل پرستی - نسلی امتیاز -

Favourable Attitude موافق رویہ - سازگار رویہ - موافق رجحان - موافق طرز عمل -

New Political Pattern نیا سیاسی ڈھانچہ - نیا سیاسی نظام - نیا سیاسی نقشہ -

Nuclear Free Zone ایٹم سے پاک علاقہ - جوہری اسلحہ سے پاک خطہ - ایٹمی اسلحہ سے پاک علاقہ -

Tension Free Area کھچاؤ سے پاک علاقہ - کشیدگی سے پاک خطہ - کشمکش سے پاک علاقہ -

Veiled Criticism مخفی تنقید - بین السطور تنقید - مستور نکتہ چینی - مخفی نکتہ چینی -

Resistance Movement مزاحمتی تحریک - مدافعتی تحریک - مزاحمتی جد و جہد -

Lust for Power ہوس جاہ - ہوس اقتدار - ہوس منصب - اقتدار کی بھوک -

rekhta

Explosive Situation دھماکہ خیز صورت حال ۔ کشیدہ صورت حال
کشیدگی کی کیفیت ۔

ضمیمہ ب

Laboratory	لیبارٹری
Organization	آرگنائزیشن
Health Centre	ہیلتھ سنٹر
Chemist	کیمسٹ
Druggist	ڈرگسٹ
Administrator	ایڈمنسٹریٹر
System	سسٹم
Politics	پالیٹکس
Opposition	اپوزیشن
Character	کریکٹر
Inspector	انسپکٹر
Black marketing	بلیک مارکیٹنگ
Act	ایکٹ
Bill	بل
Agitation	ایجی ٹیشن
Deputy	ڈپٹی
Assistant	اسسٹنٹ
Director	ڈائریکٹر
Actor	ایکٹر
Geological	جیالوجیکل

Philosophical	فلاسوفیکل
Lady Police	لیڈی پولیس
Body Building	باڈی بلڈنگ
Headquarter	ہیڈ کواٹر
Warning	وارننگ
Leader	لیڈر
Claim	کلیم
Refrendum	ریفرنڈم
Local bodies	لوکل باڈیز
Cashier	کیشئر
Research	ریسرچ
Constable	کنسٹیبل
Social Welfare	سوشل ویلفیئر
Labour Welfare	لیبر ویلفیئر
Public	پبلک
Building	بلڈنگ
Regulation	ریگولیشن
Rules	رولز
Account	اکاؤنٹ
Academic	اکیڈمک
Advance	ایڈوانس
License	لائسنس
Notes	نوٹس
Case	کیس

کورٹ	Court
پرائیویٹ سیکٹر	Private Sector
فائل	File
انکوائری	Inquiry
ریجنل	Regional
پالیسی	Policy

ضمیمہ ج

کلیمز	Claims - Claim
مینجر	Managers - Manager
انسپکٹرز	Inspectors - Inspector
ریجنز	Regions - Region
ورکرز	Workers - Worker
کیمسٹس	Chemists - Chemist
سیکٹرز	Sectors - Sector
سکولز	Schools - School
کالجز	Colleges - College
باڈیز	Bodies - Body
پیپرز	Papers - Paper
رولز	Rules - Rule
ریگولیشنز	Regulations - Regulation
سرٹیفیکیٹس	Certificates - Certificate
نوٹیفیکیشنز	Notifications - Notification

گفتگو

ڈاکٹر ریاض مجید ، اعجاز راہی

مقالہ : افسانوی ادب کے تراجم : ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

تبصرہ : انتظار حسین

مظفر علی سید :

سجاد باقر رضوی کا مقالہ جتنا مختصر اور اصولی تھا ، انتظار حسین کا تبصرہ اتنا ہی علمی اور مفصل ہے ، نذیر احمد ، رتن ناتھ سرشار ، اختر حسین رائے پوری ، ظفر انصاری اور انور عظیم وغیرہ کا ترجمے کے ضمن میں ذکر نہ کریں تو کلیہ سازی آسان ہوجاتی ہے اور ان کے بارے میں رائے دینے کی ذمے داری بھی نہیں رہتی، ترجمہ کرنے میں بعض مشکلات بھی ہیں ۔ مثلاً غیر ملکی ناولوں اور افسانوں میں کرداروں کے نام مشکل ہوتے ہیں ۔ روسی ناولوں میں تو ایک ایک کردار کے تین تین نام ہوتے ہیں اور وہ جس طرح کہانی میں آتے ہیں ، انہیں لکھنے اور سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے ۔ یہی دقت مکالمہ نگاری میں پیش آتی ہے ۔ فکاہی ادب کا ترجمہ کرتے ہوئے اور سرخ و سیاہ کا ترجمہ کرتے وقت ان دشواریوں کا اعتراف کیا گیا ہے ۔

نظیر صدیقی :

مقتدرہ قومی زبان کا احسان ہے کہ اس نے موجودہ مسئلہ پر اظہار خیال کرنے کا موقع فراہم کیا ۔ سجاد باقر رضوی صاحب نے افسانوی ادب کے تراجم کے سلسلے میں کئی مثالیں دی ہیں ۔ لیکن در حقیقت ترجمہ کی جو صورت حال ہے ، اسے خود اطمینانی کے علاوہ

کوئی نام نہیں دیا جاسکتا ۔ غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ بے شک اس کی ایک وجہ معاشی ہے ۔ مترجمین اور ناشرین پیسہ کمانے کے لیے ناولوں اور افسانوں کے ترجمے شائع کرتے رہے ہیں لیکن تراجم کی ادبی اور تخلیقی ضرورت کو پیش نظر رکھنا زیادہ ضروری ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہمارے تراجم کا معیار عالمی سطح کا ہے ؟ اردو تراجم کو دیکھا جائے تو ان میں ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی یا اگر ہے تو کم از کم میرے علم میں نہیں ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی :

اردو ادب معیاری تراجم کی مثالوں سے خالی نہیں ہے ۔ ہمارے ہاں کئی لوگوں نے عالمی معیار کے ترجمے کیے ہیں ، مثلاً عنایت اللہ دہلوی کا ''نجم السحر'' اور پروفیسر محمد مجیب کا ''اور زرتشت نے کہا'' وغیرہ کے نام بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں ۔

نظیر صدیقی :

بے شک ان ناموں کو سن کر میرے علم میں اضافہ ہوا ہے ، لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ وہ کتابیں جو کلاسیک میں شمار ہوتی ہیں یا وہ کتابیں جو اگرچہ ہمارے موجودہ عہد سے قریب ہیں ۔ لیکن جدید کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئی ہیں ، ان کے تراجم ہونے چاہیے تھے ۔ لیکن اصل صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں بعض وجوہ سے بہترین کتابوں کی بجائے دوسرے درجے کی کتابوں کے ترجمے کیے جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر مارک ٹوین کا شاہکار "ایڈونچرز آف ہکل بری فن '' ہے ۔ اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا البتہ اسی مصنف کی کتاب ایڈونچرز آف ٹوم سوئر'' کا ترجمہ کیا گیا ہے ۔ دراصل ہمارے ہاں ادب کے پی ایچ ڈی حضرات تو پیدا ہو رہے ہیں لیکن جس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے ، وہ نہیں دی جا رہی ۔ محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ کانٹ کا ترجمہ تو آسان ہے لیکن ہمارے ادیب فلابیر جیسے دو جملے نہیں لکھ سکتے ۔ اس قسم کی باتوں سے مزید بددلی پھیلتی ہے ۔ عسکری صاحب نے جو کچھ کہا تھا ، میں اسے ناکافی سمجھتا ہوں ۔ یورپی ادیب اپنے زمانے کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے مضامین لکھتے رہتے ہیں ۔ سارتر نے امریکہ کے بڑے ناول

نگاروں پر کئی تعارفی مضامین لکھے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسا کام نہیں ہوا ، حتٰی کہ عسکری صاحب نے بھی نہیں کیا ۔

مظفر علی سید :

عسکری صاحب نے جیمز جوائس پر پانچ مضامین لکھے ہیں ۔ جب کہ سارتر نے فاکنر پر ایک مضمون لکھا تھا ۔

ڈاکٹر آفتاب احمد :

عسکری صاحب نے کہا ہے کہ اردو میں ترجمہ کرنا تو درکنار ۔ پروست کو تو انگریزی میں بھی نہیں منتقل کیا جا سکتا ۔ عسکری صاحب نے خود فرانسیسی ناولوں کے ترجمے کیے ہیں ۔ وہ فرانسیسی سے نہیں ، انگریزی سے کیے ہیں ۔ پروست کے ہاں جس فضا اور سوسائٹی کے ناقابل ترجمہ ہونے کا عسکری صاحب نے ذکر کیا ہے ، وہ فرانسیسی سوسائٹی ماحول اور فضا سے مخصوص ہے ۔ اس فضا تک ہماری رسائی ممکن نہیں ۔ ان دشواریوں کے باوجود عسکری صاحب سمیت مختلف لوگوں نے یورپی شاہکاروں کے ترجمے کیے ہیں ۔ جس دور میں جس قسم کا ادب مقبول رہا ، اسی کے تراجم کیے گئے تھے یا ہمارے ادیبوں کا جو مزاج تھا ، انھوں نے اسی کے مطابق کتابیں ترجمہ کیں ۔ پنجاب کے ادیبوں نے آسکر وائلڈ کی ''سلومی اور'' اے پکچر آف ڈورین گرے'' کے ترجمے کیے کیونکہ اس دور میں رومانیت پسندیدہ رجحان تھا ۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ ہمارے جو ادیب اور دانشور اس زمانے میں انگلستان گئے وہ آسکر وائلڈ اور دیگر رومانوی ادیبوں سے متاثر ہوئے ۔ چیخوف اور موپساں کے افسانوں کے تراجم بھی اسی لیے کثرت سے ہوئے کہ اس زمانے میں انگریزی میں ان کا ذکر زیادہ ہوتا تھا ۔

مرزا حامد بیگ :

انتظار حسین نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں کافکا کا ترجمہ ہونا ضروری تھا، جو نہیں ہوا ۔ اسی لیے ہمارے ہاں علامتی افسانوں کے صحیح نمونے سامنے نہیں آسکے ۔

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی :

کافکا کا اگر ترجمہ ہو گیا ہوتا تو . . . . کی اتنی اہمیت نہ ہوتی ۔

ڈاکٹر وحید قریشی :

موجودہ بحث سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ترجمہ میں بھی وہ فضا پیدا کی جائے جو اصل ناول نگار نے پیدا کی تھی ؟

شان الحق حقی :

ترجمہ کے ایک سے زیادہ مقاصد ہو سکتے ہیں جیسا کہ میں نے اپنے مقالے میں بھی ذکر کیا ہے۔ ترجمہ کو کسی خاص مقاصد سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا ۔

مظفر علی سید :

ترجمہ در ترجمہ کی مشکلات کا عسکری صاحب نے ذکر کیا ہے ۔ ہمارے ہاں دوسری زبانوں سے براہ راست ترجمہ بہت کم ہوا ہے ۔ بعض یورپین زبانوں سے انگریزی میں جو تراجم ہوئے ، ہمارے مترجمین نے انہیں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے خود عسکری صاحب بھی فرانسیسی ناولوں کا ترجمہ کرتے وقت ڈرافٹ کسی حد تک انگریزی ترجمے کو سامنے رکھتے تھے لیکن ''مادام بوواری'' کا ترجمہ کرتے وقت انھوں نے اپنے ترجمے کا مقابلہ فرانسیسی متن سے بھی کیا تھا ۔ ''پئر گوریو'' کا ترجمہ مترجم نے'' بڈھا گوریو'' کیا تھا جب کہ فارسی میں ''بابا گوریو'' کیا گیا ہے ، جو اصل سے زیادہ قریب ہے کیونکہ ناول میں سب کردار اسے مخاطب کرتے وقت یہی لفظ استعمال کرتے ہیں ۔ وہاں ''بڈھا گوریو'' کہہ کر مخاطب کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ۔

مقالہ : شعری ادب کے تراجم ۔ مسائل اور مشکلات :
شان الحق حقی

تبصرہ : جیلانی کامران

مظفر علی سید :

مقالہ نگار اور تبصرہ نگار ، دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل نظر آتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر افہام و تفہیم کا خلا موجود تھا ۔ شان الحق حقی کی رائے میں نثر میں شاعری کا ترجمہ کرنے

سے شاعری زائل ہو جاتی ہے جب کہ جیلانی کامران کا خیال ہے کہ شاعری کو اس چیز میں منتقل کیا جا سکتا ہے جسے آج کل از راہ تضحیک نثری نظم کہا جاتا ہے ۔ اگر اعتراض یہ ہے کہ ہیئت اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں شعری تراجم کو میکانکی بنا دیتی ہیں تو پھر مترجم تو ایک طرف رہا ، شاعر کو بھی انھیں استعمال نہیں کرنا چاہیے ۔ میراجی نے عمر خیام کی رباعیات کا جو ترجمہ (مشرق و مغرب کے نغمے میں) کیا ہے ، وہ فارسی سے نہیں ، بلکہ فٹزجرالڈ کے انگریزی ترجمے سے کیا ہے غالب کے انگریزی تراجم کو یہاں ہدف تنقید بنایا گیا ہے ، تاہم جیلانی کامران نے صوفی اے کیو نیاز کے انگریزی ترجمے کو چھڑایا ہے حالانکہ اس ترجمے میں بھی دونوں زبانوں کو گھائل کیا گیا ہے ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی :

جیلانی کامران کے نزدیک بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا شعر کا شعر میں ترجمہ کرنا چاہیے یا شاعری کا شاعری میں ؟

لطیف صدیقی :

شاعری کا ترجمہ اگر نثر میں کیا جائے تو اسے بعض خرابیوں سے بچایا جا سکتا ہے ۔ شاعری کا منظوم ترجمہ اصل متن کے حسن کو پوری طرح اپنے اندر نہیں سمو سکتا ۔ کسی کتاب کے لفظی ترجمے کی افادیت اپنی جگہ ، لیکن اس کے اثرات محدود رہتے ہیں ۔ یہاں شاہ عبدالقادر کے اردو ترجمہ قرآن کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر کے اردو ترجمے سے کون سے بڑے ادیب متاثر ہوئے ہیں ؟

انتظار حسین :

شیکسپیئر کے ڈراموں کے سلسلے میں بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا ترجمہ نظم میں ہو یا نثر میں ؟ شیکسپیئر شاعر بھی اور ڈرامہ نگار بھی ، لیکن اس کی اصل حیثیت ڈراما نگار کی ہے ، اس لیے اس کے ڈراموں کے تراجم نثر میں ہونے چاہییں ۔ تاکہ انھیں سٹیج پر پیش کیا جا سکے ۔ شیکسپیئر کی شاعری کا ترجمہ شاعری میں کرنا کا ضروری ہے ۔

احسان اکبر :

ترجمہ میں اگر اصل متن کا مفہوم اور اسلوب منتقل نہ ہو تو ترجمے کا حق ادا نہیں ہوتا ۔

ثاقبہ رحیم الدین :

شعری ترجموں میں اہم مسئلہ لفظوں کا ترجمہ ہوتا ہے ۔ شاعر فضا کو تو محسوس کر لیتا ہے اور اس احساس کو منتقل بھی کر سکتا ہے ، مگر بسا اوقات لفظوں کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا ۔ جیسے "کوئی ویرانی سی ویرانی ہے" کا ترجمہ کیسے کیا جائے گا ۔ جذبے کو ترجمے میں گرفتار کرنا نہایت مشکل ہے ۔ مثلاً میر ، غالب ، آتش اور دور حاضر کے شعرا کے ہاں ایسی لفظیات ہیں ، جذبے کا اظہار جیسے ترجمہ کرنا آسان نہیں ۔ میرے خیال میں شعری تراجم کا کام اسی وقت قدرے آسان ہو سکتا ہے ، جب شعری ترجمے میں کہیں ترجمہ سے کام لیا جائے اور کہیں ترجمانی سے ۔ یہیں ایک صورت شعری ترجمہ میں معاونت کر سکتی ہے ۔

مقالہ : ڈاکٹر مسکین حجازی

احسان اکبر :

صحافت کے لیے انگریزی ، اردو لغت کی تجویز نہایت مناسب ہے ۔ ہماری صحافت میں انگریزی کے الفاظ بلا جواز اور فراوانی کے ساتھ استعمال کیے جا رہے ہیں ، اخبارات میں املا کا خیال نہیں رکھا جاتا یعنی اخبارات کو یہ تک معلوم نہیں کہ عیدالاضحیٰ ہے یا عیدالاضحی ۔ اسی طرح ابلاغ عامہ کے دوسرے ادارے جن میں ریڈیو شامل ہے ۔ اس کا بنیادی کام صحت کے ساتھ خبر دینا ہے ۔ وہاں بھی خبر میں اور دیگر نشریات غلط تلفظ کے ساتھ دی جاتی ہیں ۔ انگریزی سکولوں ، کالجوں کی تعلیم یافتہ خواتین یا حضرات منہ بگاڑ کر اردو بولتے نظر آتے ہیں ۔ جس سے تلفظ بری طرح بگڑ رہا ہے ۔ اس طرف توجہ دی جانی ضروری ہے کہ اب ریڈیو کی تقلید میں ٹیلیویژن بھی غلط تلفظ کا بری طرح شکار ہو رہا ہے ۔

شان الحق حقی :

اخباری لفظوں کی گلاسری کئی سال پہلے غالباً ١٩٦٦ء یا ١٩٦٧ء میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر نے تیار کی تھی ۔ چونکہ وہ باہر سے چھپی تھی اس لیے زیادہ نہ پھیل سکی ، مگر وہ دستیاب ہو سکتی ہے اور اخباری صنعت اس سے کام لے سکتی ہے ۔

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں :

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم ہونا چاہیے جو اخبارات میں استعمال ہونے والے لفظوں کی معیار بندی کرے ۔ اس سے نشریاتی اداروں کے ساتھ اخبارات کی زبان بھی خود بخود ٹھیک ہو جائے گی ، معیار بندی کا یہ کام مقتدرہ قومی زبان سے بھی لیا جا سکتا ہے ۔

مظفر علی سید :

ہمارے ماضی کے صحافی عالم فاضل لوگ تھے ۔ حسرت ، ظفر علی خان وغیرہ نے صحافت کے لیے جو زبان وضع کی تھی ، وہ معیاری تھی ، اس لیے کہ وسائل کی کمی کے باوجود وہ لوگ عربی فارسی سے واقف ہونے کے سبب ان زبانوں سے استفادہ کرکے زبان کو سنوارنے میں باشعور تھے ۔ مگر عربی فارسی کے زوال کے بعد اب ہماری صحافت میں اصطلاح سازی کی اہمیت پیدا نہیں ہو سکی ، چنانچہ اب ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے ۔ جو اخبارات کے لیے کتابیں تالیف کر سکیں ۔ آج صحافت ، صنعت اور تجارت بن گئی ہے ، لیکن اس میں بھی ملازمت کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور ہونا چاہیے ۔ شعبہ صحافت کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے نصاب میں تبدیلیاں لائیں اور تراجم کے کام پر زیادہ زور دیں ۔

ڈاکٹر مسکین حجازی :

جہاں تک ہماری یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کا تعلق ہے ۔ ہم نصاب کی ترتیب کے وقت عملی صحافت میں مصروف لوگوں کو بھی مدعو کرتے ہیں اور ہمارا نصاب نظری ہونے کی بجائے زیادہ تر عملی صحافت پر استوار ہوتا ہے ۔ یہاں مسئلہ کچھ اور ہے ۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگ ایسے اداروں کا رخ کرتے ہیں، جہاں ان کے معاشی مفادات کو تحفظ

حاصل ہو سکے ، اخباری صنعت یہ تحفظ فراہم کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں رہی اس لیے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کی یہاں کھپت نہیں ہو پاتی -

ڈاکٹر یسین رضوی :

ہماری خبروں کا نظام ہماری اپنی قومی زبان میں ہونا چاہیے ، گو اس وقت ٹیلی پرنٹر اور دوسرے خبری وسائل کی کمی ہے - مگر اس کمی کو جنگ ، نوائے وقت اور مشرق جیسے اخبارات نے اپنی خبریں رومن اردو میں بھیجنے کا سلسلہ شروع کرکے آسانی پیدا کر لی ہے - اس سے دوہرے ترجمے اور تضادات سے بچا جا سکتا ہے ، اگر اے - ای - پی اور پی - پی - آئی بھی یہی طریقہ کار اختیار کرے ، تو ترجمے کے اغلاط کا احتمال کم ہو سکتا ہے -

انور بھٹی :

سائنسی معلومات کے تراجم میں اخباری صنعت مفہوم ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی - میری تجویز ہے کہ ایم - اے صحافت میں ان طلبا کو جگہ دی جائے جو سائنسی پس منظر بھی رکھتے ہوں ، دوسری اہم بات ہے کہ صحافیوں کے لیے لغت سے زیادہ گلاسری کی ضرورت ہے - ،مقتدرہ قومی زبان نے اس کا ایک نمونہ بنایا ہے اسی طرح صرف انگریزی ترجمہ کافی نہیں ہے - اس وقت میں اردو ٹیلکس اور تار کا آغاز ہو چکا ہے ، مگر ابھی تک اسے عام قبولیت حاصل نہیں ہو سکی - میرے خیال میں اس کی ایک مناسب حد تک تشہیر کی ضرورت ہے -

نذیر صدیقی :

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی بی اے اور ایم اے کی سطح پر صحافت کے کورسز شروع کر رہی ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسے الفاظ جو اردو میں غیر معروف یا نامانوس نہیں ، انھیں اگر ایسے ہی رہنے دیا جائے ، تو مناسب ہوگا - مگر غیر مانوس الفاظ کا ترجمہ ضروری ہے - جو الفاظ آسانی سے اردو میں کھپ سکتے ہیں ، انھیں اردو کے قواعد کے مطابق ڈھال لیا جانا چاہیے -

منصور قیصر :

میری بھی یہی رائے ہے کہ ایسے الفاظ جو آسانی سے اردو میں

ڈھل سکتے ہیں ، انھیں اسی طرح قبول کر لیا جائے اور ان کا ترجمہ ضروری قرار نہ دیا جائے ، مگر شرط یہ ہے کہ ایسے غیر ملکی الفاظ کا نعم البدل موجود نہ ہو - اگر نعم البدل مانوس اور آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے تو انگریزی یا کوئی بھی دوسری زبان کا لفظ اختیار نہ کرنا چاہیے -

اشفاق احمد :

تراجم ہر ملک میں ہوتے ہیں - مگر وہاں صورت حال مختلف ہے دوسرے ممالک میں تراجم ضرورت کے تحت اور منظم طور پر کرائے جاتے ہیں - جب کہ ہمارے ہاں یہ عام لوگوں نے نجی طور پر اور تفریحاً کیے - مثلاً اطالیہ کی مثال لی جیے - وہاں ہر زبان سے ترجمہ کرنے والی جماعتیں موجود ہیں اور پھر کوئی قابل ذکر کتاب شائع ہوتی اور پھر اس کا ترجمہ اطالیہ میں ہوگیا ہمارے ہاں ایسی کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی لوگوں نے اپنے طور پر یہ کام کیا ہے - ندیم صہبائی اور تیرتھ رام فیروز پوری نے کیے تراجم سے عام آدمی نے فائدہ اٹھایا ۰ اب یہ کام ڈائجسٹ انجام دے رہے ہیں اور ان ڈائجسٹوں سے خلق خدا استفادہ کر رہی ہے -

ترجمہ یقیناً تخلیقی عمل نہیں ہے - مگر یہ تخلیقی عمل کے قریب تر ہے - میرے خیال میں جو اصطلاحات آرہی ہیں انھیں آنے دیا جائے ، بعض اصطلاحات کے ساتھ سماجی عزت و احترام وابستہ ہو کر رہ گئی ہے - جیسے ڈائریکٹر ، رجسٹرار اور دیگر ایسی اصطلاحات اگر جوں کی توں رکھی جائیں تو میرے خیال میں غیر مناسب نہیں -

لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن :

ترجمہ ایک نہایت ضروری عمل ہے - نہ صرف دوسری زبان سے اردو میں، بلکہ اردو سے دوسری زبانوں میں بھی معیاری تراجم کی ضرورت ہے - کچھ عرصہ قبل عرب ممالک میں ارسال کرنے کے لیے ہمیں دو قومی شعرا کے انگریزی ترجمہ کی ضرورت محسوس ہوئی - اقبال اور فیض کا نام منتخب کیا گیا - مگر افسوس ہوا کہ اعلیٰ معیار کا ترجمہ دستیاب نہ تھا یہی صورت اردو میں بھی ہے - کئی تراجم ادب و شعر کے موجود

ہیں ، مگر اعلیٰ معیار کے بغیر ترجمہ مکمل نہیں ہوتا ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایسے حالات و وسائل موجود ہونے چاہییں ، جہاں یہ ترجمہ فوری طور پر شائع ہوسکے ۔

قرآن حکیم کے تراجم کو یقینی صحیح بنانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے گئے ہیں ۔ اس لیے کہ قرآن پڑھنا یقیناً باعث برکت ہے ، مگر اس کو سمجھے بغیر مقصد پورا نہیں ہوتا ۔ اس کے سمجھنے کے لیے اعلیٰ ترجمہ ضروری ہے ۔

جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے ۔ خبروں کے ترجمہ میں ادبی رنگ ضروری نہیں ۔ اس لیے اخبار کا بنیادی مقصد جلد سے جلد خبر پہنچانا ہوتا ہے ۔ جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے ۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اردو میں مقامی لہجے آنے چاہییں ، تاکہ اردو زبان غیر مانوس نہ محسوس ، یہ ملک اور اردو کے مفاد میں ہے ۔ سندھی ، پشتو ، بلوچی اور پنجابی لہجوں سے اردو ابھر کر ایک قومی لہجے کی تخلیق کا باعث بن سکتی ہے ۔ جو تمام علاقوں کے لیے قابل قبول ہوگی اور یہ قومی یک جہتی کے لیے ضروری ہے ۔

پانچویں نشست

ترتیبِ سفارشات

صدارت	ڈاکٹر جمیل جالبی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی
مہمان خصوصی	عرفان احمد امتیازی صدر نشین مرکزی محاصل بورڈ
قراردادیں (محرک و تائید کنندگان)	مسکین حجازی ، احسان اکبر ، حبیب فخری، شان الحق حقی، جیلانی کامران ڈاکٹر ظفر اقبال ، اشفاق احمد ، محمد انور بھٹی ، طارق محمود ، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ، ڈاکٹر سہیل احمد خاں ، پروفیسر نظیر صدیقی ، بلال احمد زبیری ، سرور کامران ، ڈاکٹر اسلم فرخی ، ڈاکٹر صدیق شبلی ، عرفان احمد امتیازی ، جلیل عالی ، ڈاکٹر ایوب مرزا

قرارداد نمبر ۱

مشترکہ کمیٹی کا قیام :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان اور وزارت اطلاعات و نشریات کے باہمی تعاون سے ایک مشترکہ کمیٹی قائم کی جائے جو ابلاغیات میں مستعمل الفاظ و اصطلاحات اور نئی ایجادات کے ناموں کے موزوں اور یکساں اردو متبادل الفاظ کی معیاری فرہنگ تیار کرکے ابلاغی اداروں کو فراہم کرے ۔ یہ کمیٹی مستقل بنیاد پر کام کرتی رہے ۔

محرک : مسکین حجازی اور احسان اکبر

حبیب فخری

قرارداد نمبر ۲

علمی اور ادبی تراجم کی اہمیت :

علمی اور ادبی تراجم کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ ادبی انعامات کے سلسلے میں تراجم کو بھی شامل کیا جائے ۔

محرک : شان الحق حقی

موید : جیلانی کامران

قرارداد نمبر ۳

اردو ٹیلی پرنٹر کا اجرا :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے ذریعہ اردو ٹیلی پرنٹر سروس کا جلد از جلد اجرا کیا جائے تاکہ اردو میں خبروں کی ترسیل کے لیے موجودہ دوہرے ترجمے کا غیر ضروری سلسلہ ختم ہو جائے ۔

محرک : مسکین حجازی

موید : ظفر اقبال

قرارداد نمبر ۴

انکم ٹیکس سے استثنیٰ :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ علمی ، ادبی ، سائنسی، فنی ، (ٹیکنیکل) تراجم کا معاوضہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے ۔

محرک : اشفاق احمد ، انور بھٹی

موید : طارق محمود

قرارداد نمبر ۵

تحقیقی مقالات کے طور پر تراجم کی منظوری :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ ملک کی ان تمام جامعات میں (جہاں اس کی اجازت نہیں ہے) ایم اے کی سطح پر مقالات کے سلسلے میں کسی کتاب کے خاص اجزا کے ترجمے کو بھی مقالے کے طور پر منظور کیا جائے ۔

محرک : ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

موید : ڈاکٹر سہیل احمد خان

قرارداد نمبر ۶

مقتدرہ قومی زبان کے تحت عظیم الشان دارالترجمہ کا قیام :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان کے دارالترجمہ کو بڑے پیمانے پر توسیع دی جائے ۔ اس میں شایان شان جامع حوالجاتی کتب خانہ بھی قائم کیا جائے اور اس مقصد کے لیے مقتدرہ کو مناسب مالی وسائل فراہم کیے جائیں ۔

محرک : نظیر صدیقی

موید : ہلال احمد زبیری

قراد داد نمبر ۷

اردو کے جدید و قدیم تراجم کی جمع آوری :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان اردو تراجم کا ایک مخصوص کتب خانہ قائم کرے ۔ جس میں اردو کے تمام قدیم و جدید تراجم جمع کیے جائیں ۔ یہ کتب خانہ دارالترجمہ کے کتب خانے کا ایک حصہ ہو ۔

محرک : سرور کامران ، ہلال احمد زبیری

موید : طارق محمود

قراد داد نمبر ۸

امہات الکتب کے تراجم :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان مختلف موضوعات کی اہم ترین کتب (امہات الکتب) کا ترجمہ اردو میں شائع کرنے کا انتظام کرے ۔

محرک : ڈاکٹر اسلم فرخی

موید : مظفر صدیقی

rekhta

قرارداد نمبر ۹

محکموں کے نام اردو میں رکھے جائیں :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ حکومت کے زیر اہتمام، جو نئے ادارے محکمے یا دوسرے انتظامی شعبے قائم کیے جائیں، انھیں انگریزی ناموں کی بجائے اردو ناموں سے موسوم کیا جائے۔ نیز جو نئے منصوبے مرتب کیے جائیں یا عہدے اور اسامیاں قائم کی جائیں ان کے نام بھی اردو میں رکھے جائیں اور موجود انگریزی ناموں کو (بجز ان الفاظ یا ناموں کے جنھیں اردو زبان نے قبول کر لیا ہے) تدریجاً تبدیل کر دیا جائے۔

محرک : شان الحق حقی
مؤید : سرور کامران

قرار داد نمبر ۱۰

استناد کا حتمی اختیار مقتدرہ کو دیا جائے :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ مختلف اداروں اور افراد کی بنائی ہوئی اصطلاحات کی معیار بندی اور استناد کا حتمی اختیار مقتدرہ قومی زبان کو دیا جائے اور یہی اصطلاحات جملہ اردو کتب میں استعمال کی جائیں۔

محرک : ہلال احمد زبیری
مؤید : ڈاکٹر ظفر اقبال

قرارداد نمبر ۱۱

مترجمین کے لیے تربیتی ادارے کا قیام :

سفارش کی جاتی ہے کہ اچھے مترجمین کی کمی کے پیش نظر ترجمے کا ایک تربیتی ادارہ مقتدرہ قومی زبان کے زیر انتظام قائم کیا جائے اور ملک کی تمام جامعات میں فن ترجمہ کا کورس مناسب سطح پر داخل نصاب کیا جائے۔

محرک : ہلال احمد زبیری
مؤید : ڈاکٹر صدیق شبلی

قرار داد نمبر ۱۲

سرکاری افسران و اہل کاران کی تربیت :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ سرکاری افسران و اہل کاران کو تربیت کے دوران اردو کے ان تمام الفاظ و اصطلاحات سے پوری طرح واقف کرا دیا جائے جو مختلف انتظامی امور اور شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

محرک : عرفان احمد امتیازی
تائید : احسان اکبر

قرار داد نمبر ۱۳

انجمن ترقی اردو کی لغت میں ترامیم و اضافے کیے جائیں :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ انگریزی اردو لغت کو ترمیم و نظر ثانی اور کم از کم پندرہ ہزار نئے الفاظ کے اضافے کے ساتھ شائع کرنے کا فوری انتظام کیا جائے تاکہ مترجمین اور طلبہ کی ایک شدید ضرورت پوری ہو سکے۔

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ ''اردو ۔ انگریزی'' لغت بھی اسی پیمانے پر تیار کی جائے۔

محرک : ہلال احمد زبیری
مؤید : طارق محمود

قرارداد نمبر ۱۴

اردو تدریس کے مسائل پر کانفرنس کا انعقاد :

یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ جامعہ پنجاب کے شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر رفیق احمد صاحب کی مجوزہ "اردو تدریس کے مسائل'' پر کانفرنس کی میزبانی کی پیش کش شکریے کے ساتھ قبول کی جائے مقتدرہ قومی زبان اس کانفرنس کے جلد از جلد انعقاد کے لیے اقدامات کرے تاکہ کانفرنس میں

موجودہ نصابات ، دستیاب کتب ، طریق تدریس وغیرہ سے متعلق مسائل و امور پر غور و خوض ہو سکے ۔

محرک : احسان اکبر

تائید : جلیل عالی

قرارداد نمبر ۱۵

ویڈیو کیسٹ اور فلموں کی تیاری :

سفارش کی جاتی ہے کہ قومی زبان میں سائنسی موضوعات پر ویڈیو کیسٹ اور فلمیں تیار کی جائیں اور اسکول کالجوں کو مہیا کی جائیں ۔

تحریک : ڈاکٹر ظفر اقبال

تائید : طارق محمود

قرارداد نمبر ۱۶

جدید مشینی آلات کا استعمال :

سفارش کی جاتی ہے کہ قومی اور علاقائی زبانوں کے مابین جدید مشینی آلات کے استعمال سے ترجمہ بہت آسان ہو گیا ہے - اس صورت حال کے پیش نظر یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں ۔

محرک : شان الحق حقی

تائید : ڈاکٹر ایوب مرزا

rekhta